بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سیرتِ امیرالمومنین

حضرت علی ابنِ ابی طالبؑ

(حصّہ اوّل)

تالیف
علّامہ مفتی جعفر حسین اعلی اللہ مقامہ

ناشر۔ اِمامیہ پبلیکیشنز
۳۵۔ حیدر روڈ اسلام پورہ لاہور
فون: 7119027

غرض حضرت علیؑ کے حصہ میں نسل و خاندان کی ہر وہ فضیلت آئی جو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے پائے نام تھی اور آنحضرتؐ سے اتحادِ نسل کے اعتبار سے اور سلسلۂ آباؤ اجداد کے لحاظ سے اور شیخ البطحا ابوطالب کے ذریعہ جو شرف و امتیاز انہیں حاصل ہے وہ جلالتِ نسبی کے ماتھے کا جھومر اور شرافتِ حسبی کے کلاہ کا طرّۂ درخشاں ہے۔

ابوطالب ابنِ عبدالمطلب

حضرت ابوطالب کا اصلی نام اپنے جدّ اعلیٰ کے نام پر عبد مناف تھا۔ اور بعض تذکرہ نگاروں نے عمران لکھا ہے اور اکثر متقدمین کے نزدیک ابوطالب ہی کنیت تھی اور ابو طالب ہی نام تھا۔ آپ پیغمبر اکرمؐ سے پینتیس ۳۵ برس عمر میں بڑے تھے۔ آنحضرت عام الفیل میں پیدا ہوئے اور آپ واقعہ فیل سے پینتیس سال قبل مکہ معظمہ میں متولد ہوئے۔ تینتالیس برس حضرت عبدالمطلب ایسی عظیم شخصیت کے زیر سایہ رہے۔ انہی سے حکمت و اخلاق کے سبق لئے اور علم و ادب کے درس پائے۔ اور اس تعلیم و تربیت کے نتیجہ میں علمی و ادبی رفعتوں کے نقطۂ کمال پر فائز ہوئے اور اپنے دور میں ایک بلند پایہ ادیب، ممتاز سخن طراز، عظیم مفکر اور بالغ النظر قائد تسلیم کئے گئے۔ اس علمی، ادبی اور فکری کمال کے ساتھ وجیہہ صورت، کشیدہ قامت، بھاری بھرکم، پُرعزم و پُر وقار اور بارعب شخصیت کے مالک تھے۔ چہرے مہرے سے ہاشمی اور خدو خال سے قریشی سطوت جھلکتی تھی۔ زبان سے فصاحت و بلاغت کے سوتے پھوٹتے اور علم و حکمت کے سرچشمے اُبلتے تھے۔ اپنے اسلاف کے اعلیٰ کردار و بلند اوصاف کے درثہ دار اور اولادِ عبدالمطلب میں سب سے زیادہ عادات و اطوار میں اپنے پدر بزرگوار سے مشابہ تھے۔

حضرت عبدالمطلب کے بعد حرم کے عہدے رفادہ و سقایہ انہی سے متعلق ہوئے اور شیخ ابطح، سیّد بطحا اور رئیس مکہ ایسے وقیع القاب سے یاد کئے گئے۔ دیار بکری لکھتے ہیں:۔

وکان عبد المطلب بعد هاشم	ہاشم کے بعد حاجیوں کو کھانا دینے کی خدمت
يلى الرفادة فلما توفى قام بذالك	عبدالمطلب سے متعلق ہوئی اور عبدالمطلب کی
ابوطالب فى كل موسم حتى جاء	وفات کے بعد ظہور اسلام تک ہر سال یہ خدمت
الاسلام۔ (تاریخ خمیس۔ ج ۱۔ صـ ۱۵۷)	ابوطالب انجام دیتے رہے۔"

دنیا میں حصولِ منصب کے لئے دولت ایک بڑا ذریعہ ہے۔ مگر آپ کی قیادت و سربراہی اور منصبی

سربلندی دولت کی رہین منت نہ تھی بلکہ ان کی فرض شناسی، حسن عمل اور کردار کی انفرادیت نے انہیں عزت عظمت اور سرداری کے بام تک پہنچایا۔ حضرت علی فرماتے ہیں:۔

ابی ساد فقیرا وما ساد فقیر قبلہ۔ (تاریخ یعقوبی۔ ج ۲۔ ص ۱۴۱)

میرے والد نادار ہوتے ہوئے سردار قرار پائے حالانکہ ان سے پہلے کوئی نادار سردار نہیں ہوا۔"

اگرچہ ابوطالب کی مالی کمزور حالت اور اُن کے وسیع حوصلوں کا ساتھ نہ دے سکتی تھی پھر بھی جس طرح بن پڑتا محتاجوں اور ناداروں کی اعانت کرتے، حاجیوں کے لئے بڑی نفاست سے کھانے پکواتے، پانی کے بڑے بڑے حوضوں میں کھجوریں اور کشمش ڈلوا دیتے تاکہ اللہ کے مہمانوں کو خوش ذائقہ و خوش مزہ پانی پینے کو ملے۔ ایک سال آپ معمول سے زیادہ تنگ دست تھے اور دور و دراز سے آنے والے حاجیوں کے خورد و نوش کے انتظامات سے قاصر۔ آپ نے اپنے بھائی عباس ابن عبدالمطلب سے دس ہزار درہم قرض لئے اور وہ ساری رقم حاجیوں کے کھانے پینے میں صرف کر دی۔ اگلے سال پھر یہی صورت پیش آئی کہ نہ کھانے پینے کا سامان مہیا کر سکے اور نہ قرضہ ہی اتار سکے۔ آپ نے دوبارہ عباس سے چودہ ہزار درہم طلب کئے تاکہ سرزمین حرم کے مہمانوں کی خاطر داری و ضیافت کر سکیں۔ عباس اس شرط پر قرضہ دینے کے لئے آمادہ ہوئے کہ اگر سال آئندہ تک یہ تمام قرضہ ادا نہ ہوا تو یہ منصب ان سے لے لیا جائے گا۔ ابوطالب سال آئندہ تک بھی اس بار سے سبکدوش نہ ہو سکے اور یہ منصب عباس کے سپرد کر دیا۔ جو ان کی اولاد میں منتقل ہوتا رہا۔ آپ نے منصب سے دست کش ہونا گوارا کر لیا مگر یہ گوارا نہ کیا کہ مکہ میں آنے والے حجاج بھوکے پیاسے رہیں یا سادہ و بدمزہ پانی پئیں۔

ابوطالب اپنے پہلو میں ایک درد مند اور حساس دل رکھتے تھے جو دوسروں کے دلوں کی دھڑکنیں سنتا اور مصیبت زدوں کی مصیبت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا۔ اسی جذبۂ ہمدردی و انسان دوستی کو دیکھتے ہوئے پریشان حال انسانوں کے قافلے ان کے حریم امن کے گرد چکر لگاتے اور وہ دل و جان سے اُن کی مدد کرتے اور اُن کے دُکھ درد میں شریک ہوتے۔ مظلوم و ستم رسیدہ اُن کے دامن میں پناہ مانگتے اور وہ اُن کے سینہ سپر بن کر کھڑے ہو جاتے اور انہیں پناہ دے کر اُن کی حفاظت کا ذمہ لے لیتے۔ چنانچہ ابوسلمہ مخزومی جب حبشہ سے پلٹ کر مکہ آیا اور بنی مخزوم اسلام کی بنا پر اس کے درپے ایذا ہوئے تو ابوسلمہ آپ سے پناہ کا طلبگار ہوا آپ نے اسے پناہ دے کر اس کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ بنی مخزوم کو معلوم ہوا تو وہ ابوطالب کے پاس آئے اور کہا کہ آپ نے اپنے بھتیجے محمدؐ کو بھی پناہ دے رکھی ہے اور اب ابوسلمہ کو بھی اپنی حفاظت اور پناہ میں لے لیا ہے۔ اسے ہمارے حوالے کیجئے۔ فرمایا کہ وہ میرا بھانجا[1] ہے۔ جب اس نے مجھ سے پناہ طلب کی

---

[1] ابوسلمہ برہ بنت عبدالمطلب کے بطن سے عبدالاسد کا بیٹا اور ابوطالب کا حقیقی بھانجا تھا۔

تو میری حمیت نے گوارا نہ کیا کہ اسے پناہ میں لینے سے انکار کر دوں۔ اگر میں اپنے بھانجے کو پناہ نہ دوں گا، تو اپنے بھتیجے کو بھی پناہ نہ دے سکوں گا۔ اب اسے پناہ میں لینے کے بعد اس کی حمایت سے کنارہ کش نہیں ہو سکتا۔ یہ صاف جواب سن کر بنی مخزوم خاموش ہو گئے اور مزید کچھ کہنے کی جرأت نہ کر سکے۔

اس تاریک معاشرہ میں جب کہ انسانیت کی قدریں دم توڑ رہی تھیں اور اخلاق پستی کی آخری حدوں کو چھو رہے تھے آپ نے اخلاقی رذائل سے اپنے دامن کو آلودہ نہ ہونے دیا۔ اور جب کہ جگہ جگہ جوا کھیلا جاتا تھا اور گھر گھر شراب پی جاتی تھی آپ نے نہ کبھی قمار بازی کی طرف رخ کیا اور نہ کبھی شراب کو منہ لگایا۔ احمد ابن زینی وحلان نے تحریر کیا ہے:۔

كان ابوطالب ممن حرم الخمر على نفسه فى الجاهلية كابيه عبدالمطلب۔ (سیرت نبویہ۔ صـ۸۰)	ابوطالب نے اپنے باپ عبدالمطلب کی طرح زمانۂ جاہلیت میں بھی شراب اپنے اوپر حرام کر لی تھی۔"

ابوطالب خود ہی فواحش و منکرات سے گریزاں نہ تھے بلکہ جہاں تک بن پڑا دوسروں کو بھی عیوب و قبائح سے اجتناب کی تلقین کرتے۔ معاشرہ کی اصلاح اور ملک و قوم کی فلاح و بہبود میں کوشاں رہتے۔ تجارت اور کسبِ حلال پر زور دیتے۔ خانہ کعبہ کی تعمیر نو کے وقت انہی نے قریش کو اس طرف متوجہ کیا تھا کہ وہ اس کی تعمیر پر مالِ حرام و مشتبہ نہ لگائیں بلکہ جائز و حلال مال صرف کریں۔ چنانچہ قبلِ اسلام جب خانہ کعبہ کی دیواریں سیلاب سے متاثر ہو کر بیٹھنے لگیں اور اس کے منہدم ہونے کا خطرہ لاحق ہوا تو قریش نے چاہا کہ اسے منہدم کر کے از سرِ نو تعمیر کریں۔ جب اس کی دیواریں گرائی گئیں تو بنیادوں کے قریب ایک پھنکارتا ہوا اژدہا نظر آیا۔ لوگ اسے دیکھ کر خوف زدہ ہو گئے اور کام وہیں کا وہیں رک گیا۔ قریش کوئی ترکیب سوچ ہی رہے تھے کہ ابوطالب نے کہا:۔

ان هذا لا يصلح ان ينفق فيه الا من طيب المكاسب فلا تدخلوا فيه من ظلم وعدوان۔ (تاریخ یعقوبی۔ ج ۲۔ صـ۱۹)	یہ تعمیر اس لائق ہے کہ اس پر صرف پاک و پاکیزہ اور حلال کمائی لگائی جائے۔ لہذا وہ مال نہ لگاؤ جو ظلم و زیادتی سے حاصل کیا گیا ہے۔"

ان لوگوں نے ایسا ہی کیا اور کسبِ حلال سے کمایا ہوا سرمایہ تعمیر کے لئے مخصوص کر دیا۔ اب جو کعبہ کے قریب آئے تو دیکھا کہ ایک پرندہ اس اژدہے پر جھپٹا اور اسے اپنے پنجوں میں جکڑ کر بلندی کی طرف پرواز کر گیا اور تعمیر کے لئے راستہ صاف ہو گیا۔

ابوطالب اپنے معاشرہ میں ایسا نظام بروئے کار لانا چاہتے تھے جس کی اساس عدل و انصاف پر استوار ہو۔ نہ کسی کی حق تلفی ہو اور نہ کسی پر بیجا زیادتی۔ چنانچہ اسی جذبہ کے پیش نظر انہوں نے علقمہ کے خون کے بارے میں قسامت[1] کا طریقہ جاری کیا۔ اسلام نے بھی اس طریق کار کی افادیت کے پیش نظر اسے برقرار رکھا۔ ابن ابی الحدید نے تحریر کیا ہے:۔

وابو طالب اول من سن القسامه فی الجاهلیة فی دم عمرو ابن علقمة ثم اثبتتها السنة فی الاسلام۔ (شرح ابن الحدید ج ۳۔ صـ ۱۴۶)

زمانۂ جاہلیت میں ابوطالب نے عمرو ابن علقمہ کے خون کے بارے میں پہلے پہل قسامت کا طریقہ رائج کیا۔ پھر اسلام نے بھی اسے اپنے احکام میں جگہ دے دی۔"

ابوطالب دوستی ہو یا دشمنی کسی موقع پر حق و انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ اور عام حالات ہی میں ظلم و زیادتی کے خلاف نہ تھے بلکہ جنگ کی معرکہ آرائیوں میں بھی غیر ضروری کشت و خون اور ناروا خونریزی کے شدید مخالف تھے۔ چنانچہ قبل اسلام قریش اور قبیلہ قیس میں ایک جنگ لڑی گئی جو حرب فجار کے نام سے موسوم ہے۔ اس جنگ میں قریش کے ساتھ بنی ہاشم بھی شریک ہوئے۔ پیغمبر اکرم ابھی کمسن تھے وہ بھی اپنے چچا ابوطالب کے ساتھ آتے مگر نہ جنگ میں حصہ لیتے اور نہ کسی پر ہاتھ اٹھاتے۔ جس دن ابوطالب آتے، قریش کا پلہ بھاری رہتا۔ قریش ان کی شمولیت کو وجہ کامرانی سمجھتے ہوئے کہتے کہ آپ لڑیں یا نہ لڑیں صرف ہمارے پاس موجود رہا کریں اس لئے کہ آپ کی موجودگی میں ہمیں ڈھارس رہتی ہے اور فتح و ظفر کے آثار نظر آتے ہیں۔ آپ نے فرمایا:۔

اجتنبوا الظلم والعدوان و القطیعة والبهتان فانی لا

تم ظلم، بے جا زیادتی، قطع رحمی اور الزام تراشی سے بچ کر رہو گے تو میں تمہاری نظروں سے اوجھل

---

[1] قسامت کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی فرد قتل ہو جائے اور اس کے ورثہ میں سے کوئی دعویٰ کرے کہ فلاں اس کا قاتل ہے اور اثبات دعوے کے لئے دو عادل گواہ نہ پیش کر سکے۔ مگر ایسے قرائن و شواہد موجود ہوں جن سے مدعی کے دعوے کی تائید ہوتی ہو تو مدعی اور اس کے قبیلہ والوں سے پچاس قسمیں لی جائیں گی کہ فلاں قاتل ہے اور اگر قسم کھانے کی گنتی پچاس سے کم ہو تو ان سے کئی بار قسمیں لے کر پچاس کا عدد پورا کیا جائے گا۔ مثلاً پچیس افراد ہوں تو ہر ایک سے دو دو بار قسم لے کر پچاس کی گنتی پوری کی جائے گی اور مدعا علیہ کو قاتل قرار دے دیا جائے گا اور اس طرح مقتول کا خون رائیگاں نہ جانے پائے گا۔ ۱۲

اغیب عنکم (تاریخ یعقوبی۔ ج ۲۔ صـ۲۶) نہیں ہو گا"

یہ تھی حضرت ابو طالب کی بلند نظری کہ جنگ و قتال کے پُر جوش ہنگاموں میں انتقامی اور دفاعی اقدامات کے حدود میں فرق و فاصلہ برقرار رکھے ہوئے ظلم و زیادتی کو بُری نظروں سے دیکھتے ہیں اور صرف اسی حد تک جنگ کے روادار رہتے ہیں جہاں تک جنگ اصول حرب و ضرب کے حدود کے اندر رہ کر لڑی جائے اور اسے وحشت و بربریت اور درندگی و خونخواری سے تعبیر نہ کیا جا سکے۔

ابو طالب اعتدال پسندی، انصاف پروری اور حلم و برد باری کے جوہر سے آراستہ تھے اور عرب کے نامور حکمائو دانشمند اُن سے استفادہ کرتے اور اُن سے اخلاق فاضلہ کے درس لیتے تھے۔ چنانچہ احنف ابن قیس سے جو عرب میں حلم و بردباری کے لحاظ سے شہرہ آفاق تھا پوچھا گیا کہ تم نے حلم و بردباری کا سبق کس سے لیا ہے؟ کہا حکیم عرب اکثم ابن صیفی سے اور اکثم ابن صیفی سے پوچھا گیا کہ تم نے حکمت، ریاست، حلم اور سرداری و سربراہی کے اصول کس سے سیکھے ہیں؟ کہا:۔

من حلیف الحلم والادب سید العجم والعرب ابی طالب ابن عبدالمطلب۔	سردار عرب و عجم، سراپا حلم و ادب ابو طالب ابن عبدالمطلب سے"

(ہدیۃ الاحباب۔ صـ۲۵۲)

آپ اپنے دور میں ایک مدبّر و معلّم اخلاق اور مفکّر و دانشمند ہی نہ تھے بلکہ ایک بلند پایہ شاعر و سخن دان بھی تھے۔ اور ایک دیوان "دیوان شیخ الاباطح" کے علاوہ ان کے اشعار کا ایک کافی وافی ذخیرہ تاریخ و سیر کی کتابوں میں بکھرا پڑا ہے۔ یوں تو عرب شعر و شاعری کا گہوارہ تھا اور مجلسوں، بازاروں اور میلے ٹھیلوں میں تفاخر و خود ستائی کی آوازیں قصائد کی صورت میں گونجا کرتی تھیں مگر معانی و مطالب کے لحاظ سے آپ کی راہ دوسروں کی راہ سے مختلف تھی۔ ان کے اشعار میں نہ بیجا خود ستائی کا شائبہ تھا اور نہ ابتذال اور بازاری پن کی جھلک بلکہ روانی و سادگی اور متانت و حُسن نظم کے ساتھ ان میں اخلاقی تعلیمات اور حق پرستی و حق نوازی کے زرّیں درس ہوتے تھے۔ اسی لئے حضرت علیؑ اُن کے اشعار کو علمی و اخلاقی سرمایہ سمجھتے ہوئے فرماتے تھے۔

تعلموہ وعلموہ اولادکم فانہ کان علی دین اللہ وفیہ علم کثیر۔	ان کے اشعار پڑھو اور اپنی اولاد کو پڑھاؤ اس لئے کہ وہ دینِ خدا پر تھے اور ان کے کلام میں علم کا بڑا ذخیرہ ہے"

(بحار الانوار۔ ج ۹۔ صـ۲۴)

ان امتیازات کے علاوہ نسبی و خاندانی بلندی کے لحاظ سے اور رسولِ خدا کی تربیت اور اسلام اور بانیٔ اسلام کے گراں قدر خدمات کے اعتبار سے بھی ان کی عظمت مسلّم ہے۔ پیغمبرؐ اکرم نے انہی کے دامنِ عاطفت میں

پرورش پائی، اور انہی کے زیر سایہ زندگی کا بیشتر عرصہ بسر کیا۔ آنحضرتؐ کے والد ماجد جناب عبداللہ آپ کی ولادت سے پہلے ہی انتقال فرما چکے تھے اور جب چھ برس کے ہوئے تو آپ کی والدہ ماجدہ جناب آمنہ نے بھی انتقال فرمایا اور آپ اپنے دادا عبدالمطلب کے آغوشِ شفقت میں پرورش پاتے لگے۔ لیکن دو ہی برس گزرے تھے کہ دادا نے بھی دنیا سے رحلت فرمائی۔ مگر زندگی کے آخری لمحوں میں ابوطالب سے خصوصی طور پر وصیت فرما گئے کہ وہ آنحضرت کی کفالت و نگہداشت میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھیں۔ ابوطالب خود بھی یتیم عبداللہ سے اتنی محبت و الفت رکھتے تھے۔ کہ جس کے بعد کسی وصیت کی احتیاج نہ تھی۔ چنانچہ جب انہوں نے آنحضرتؐ کے بارے میں اپنے پدر بزرگوار کی وصیت کو سنا تو کہا:۔

یا ابت لا توصنی بمحمدؐ فانہ ابنی و ابن اخیہ۔

(مناقب۔ ج ۱۔ ص ۲۱)

بابا مجھے محمدؐ (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) کے بارے میں وصیت کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ تو میرے بیٹے اور بھتیجے ہیں"

حضرت عبدالمطلب کثیر الاولاد تھے۔ اور آخر وقت ان کے تمام عزیز و اقارب اور بیٹے اُن کے گرد و پیش جمع تھے۔ اور اُن میں سے ہر ایک بآسانی اس بار کفالت کا متحمل ہو سکتا تھا۔ مگر آپ نے انتہائی بصیرت و دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے تربیت و کفالت کا ذمہ دار ابوطالب کو ٹھہرایا کیونکہ انہوں نے آنحضرتؐ کے ساتھ ابوطالب کے طرزِ عمل اور برتاؤ سے بخوبی اندازہ کر لیا تھا کہ جو محبت و شیفتگی انہیں یتیم عبداللہ سے ہے وہ کسی دوسرے کو نہیں ہے۔ اور تربیت کی تکمیل کے لئے محبت و شفقت کے جذبات از بس ضروری ہیں۔ لہٰذا ان سے بہتر کوئی دوسرا اس خدمت کو سرانجام نہ دے سکے گا۔ اور بعد کے حالات نے بتا دیا کہ جو توقعات ان سے وابستہ کئے گئے تھے وُہ غلط نہ تھے بلکہ ان توقعات سے کہیں بڑھ چڑھ کر ثابت ہوئے اس کے علاوہ اس امر سے بھی انتخاب کو تقویت پہنچی ہو گی چونکہ ابوطالب اور عبداللہؑ صرف صلبی یگانگت ہی نہیں بلکہ بطنی یگانگت بھی ہے۔ لہٰذا جس ہمدردی و غمگساری اور خلوص و ایثار کی ان سے توقع ہو سکتی ہے وہ دوسرے مختلف البطن بھائیوں سے نہیں ہو سکتی۔ اور کیا بعید ہے کہ آسمانی صحیفوں میں آنے والے نبی کے بارے میں پیشین گوئیوں کو پڑھ کر اور ابوطالب میں اسلام پروری و ایمان نوازی کے جوہر دیکھ کر اس دُعائے خلیل اور نوید مسیحا کو ان کے آغوش کے سپرد کیا ہو۔ اور بعض مورخین نے یہ بھی لکھا ہے کہ ابوطالب اور زبیر ابن عبدالمطلب میں قرعہ اندازی کی گئی ہو اور قرعہ ابوطالب کے نام نکلا۔ اور ایک قول یہ ہے کہ جب ان دو میں معاملہ دائر ہوا تو آنحضرتؐ نے ابوطالب کا دامن پکڑ لیا۔ اور انہی کے کنار عاطفت میں رہنے کی خواہش کی۔ بہر حال یہ انتخاب کسی بناء پر ہوا ہو اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ

اللہ کے خصوصی لطف وکرم کا کرشمہ تھا اور مشیت ایزدی بھی یہی چاہتی تھی کہ یہ امانت ابوطالب کے سپرد ہو اور انہی کے پاکیزہ آغوش میں پروان چڑھے۔ چنانچہ قدرت نے آنحضرتؐ پر جو جو احسانات فرمائے ان میں سے اس احسان کا خاص طور پر تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا ہے: الم یجدک یتیما فاوی (کیا اس نے تمہیں یتیم پا کر پناہ نہ دی) مفسرین کا اتفاق ہے کہ اس پناہ سے مراد حضرت ابوطالب کا سایۂ عاطفت و آغوشِ شفقت ہے۔

غرض ابوطالب نے اپنے مرنے والے باپ کی وصیت کے مطابق آنحضرتؐ کو اپنے آغوشِ تربیت میں لے لیا اور وہ تمام فرائض جو ایک مربّی و نگران کے ہو سکتے ہیں نہایت حسن خوبی سے انجام دیئے اور اس طرح محبت و دلسوزی سے تربیت کی کہ ہر مؤرخ کے قلم نے اس کا اعتراف کیا ہے۔ ابن سعد نے تحریر کیا ہے:۔

کان یحبّه حبّاً شدیداً لا یحب ولده وکان لاینام الا الیٰ جنبه ویخرج فیخرج معه وصب به ابوطالب صبابة لم یصب مثلها بشیٔ قط۔ (طبقات ج ۱ ص ۱۱۹)	ابوطالب رسولِ خدا سے بے انتہا محبت کرتے اور اپنی اولاد سے زیادہ انہیں چاہتے تھے ان کے پہلو میں سوتے، جب کہیں باہر جاتے تو انہیں ساتھ لے جاتے اور دنیا جہان کی ہر چیز سے زیادہ اُن پر فریفتہ و گرویدہ تھے۔"

ابوطالب نے ابتداء سے آنحضرتؐ کی زندگی کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور اُن کی افتادِ طبع اور اطوار و عادات کو اچھی طرح دیکھا بھالا تھا کہ وہ کم سخن، کم آمیز اور تنہائی پسند ہیں، نہ کھیل کود میں دلچسپی لیتے ہیں نہ سیر و تفریح میں۔ نہ ان سے کوئی ناسزا بات سننے میں آتی ہے اور نہ کوئی ناروا چیز دیکھنے میں۔ اور پھر عبدالمطلب کی مثالی خودداری اور رکھ رکھاؤ کے باوجود یتیم عبداللہ کے ساتھ اُن کا پُرشفقت و عظمت آمیز رویہ بھی دیکھا تھا۔ ان تمام چیزوں نے ابوطالب کو اس قدر متاثر کیا تھا کہ وہ شروع ہی سے آنحضرتؐ کی غیر معمولی شخصیت کے متعلق سوچنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ اور جب آپ سے خوارق عادات اور مافوق العادہ آثار ظاہر ہوتے دیکھے تو بخوبی سمجھ گئے کہ یہ بچہ عام بچوں کی سطح سے بلند تر اور غیر معمولی عظمت و رفعت کا مالک ہے۔ اسی لئے جہاں محبت ان کے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے تھی وہاں عقیدت و ارادت بھی ان کے دل میں گھر کر گئی اور اسی محبت و عقیدت نے انہیں ہر قسم کی قربانی دینے پر آمادہ کر دیا۔

ابوطالب نے آنحضرتؐ سے جو کرامات و خوارق عادات دیکھے اُن میں سے یہ چیز تو ہر روز مشاہدہ کرتے کہ جب آنحضرتؐ دسترخوان پر موجود ہوتے تو کھانا خواہ کتنا کم ہوتا سب شکم سیر ہو جاتے اور کوئی بھی بھوکا نہ رہتا۔ اس لئے آپ نے یہ معمول قرار دے لیا تھا کہ اگر آنحضرت کھانے کے وقت کہیں ادھر اُدھر ہوتے تو

نہ خود کھاتے اور نہ کسی کو کھانے کی اجازت دیتے اور فرماتے کہ جب تک میرا بھتیجا نہ آجائے کوئی کھانے کو نہ چھوئے۔ جب وہ آتے تو سب مل کر کھانا کھاتے۔ اگر کوئی دستر خوان پر سے کوئی دودھ کا پیالہ اٹھاتا تو کہتے ٹھہرو پہلے میرے بھتیجے کو پینے دو۔ جب وہ پی لیتے تو پھر دوسرے پیتے۔ اور سب سیر و سیراب ہو جاتے۔ ابوطالب یہ دیکھ کر آنحضرتؐ سے کہتے انك لمبارك۔ تم تو بڑے ہی بابرکت ہو"

آپ ایک مرتبہ آنحضرتؐ کے ہمراہ کہیں جا رہے تھے جب عرفہ سے تین میل کے فاصلہ پر مقام ذی المجاز میں پہنچے تو پیاس محسوس کی۔ آنحضرت سے کہا کہ اے میرے بھتیجے کیا آس پاس کہیں پانی مل سکتا ہے؟ آنحضرتؐ اونٹ سے نیچے اُترے اور ایک پتھر پر ٹھوکر ماری اور زبان مبارک سے کچھ فرمایا۔ اِدھر الفاظ ختم ہوئے اُدھر پتھر سے پانی کا دھارا بہہ نکلا۔ فرمایا چچا پانی پی لیجئے۔ جب پی چکے تو آنحضرت نے دوبارہ ٹھوکر ماری اور ابلتا ہو چشمہ خشک ہو گیا۔ انہی آثار خیر و برکت کو دیکھ کر ابوطالب انہیں اپنی دعاؤں کا وسیلہ بناتے اور ان کے صدقہ سے بارانِ رحمت طلب کرتے۔ چنانچہ ایک دفعہ مکہ میں بارش کے نہ ہونے سے شدید قحط پڑ گیا۔ لوگ خشک سالی سے گھبرا اٹھے۔ کوئی کہتا لات و عزیٰ سے التجا کریں۔ کوئی کہتا منات کے آگے گڑگڑائیں کہ ایک خوش وضع و خوش فکر بزرگ نے کہا:

انی توٗفکون وفیکم باقیۃ ابراھیم وسلالۃ اسمٰعیلؑ (تاریخ الاسلام ذہبی ۲۳۱)	کہاں بھٹک رہے ہو حالانکہ تمہارے اندر یادگار ابراہیمؑ و فرزندِ اسمٰعیلؑ موجود ہیں"

لوگوں نے کہا کیا اس سے تمہاری مراد ابوطالب ہیں؟ کہا کہ ہاں۔ یہ سنتے ہی لوگ ابوطالب کے ہاں آئے اور کہا کہ اے سردارِ قریش ہم قحط اور خشک سالی سے تباہ حال ہو چکے ہیں۔ ہمارے لئے بارش کی دعا کیجئے۔ آپ نے یتیم عبد اللہ کا ہاتھ پکڑا اور خانہ کعبہ کے پاس آئے اور آنحضرتؐ کو دیوارِ کعبہ کے پاس بٹھایا اور ان کی انگشت مبارک کو اوپر اٹھا کر حرکت دی۔ بارش کے کوئی آثار نہ تھے لیکن دیکھتے ہی دیکھتے تیز و تند ہوائیں چلنے لگیں۔ ابرِ رحمت جھوم کے اٹھا اور اس شدت سے پانی برسا کہ سوکھی ہوئی زمین سیراب ہو گئی اور خشک صحراؤں میں شادابی آگئی۔

ابوطالب گیہوں اور عطر کے معروف تاجر تھے اور قریش کے دستور العمل کے مطابق سال میں ایک بار تجارت کی غرض سے شام جاتے تھے۔ جب ان کے سفرِ شام کا زمانہ قریب آیا تو انہوں نے آنحضرتؐ سے اپنے سفر کا ذکر تو کیا مگر آپ کو ساتھ لے جانے کا خیال ظاہر نہ کیا۔ کیونکہ اس وقت آپ کی عمر بارہ سال کی تھی اور دور دراز کے سفر کی صعوبتیں جھیلنے کے قابل نہ تھے۔ جب آنحضرتؐ کو معلوم ہوا کہ چچا انہیں ساتھ لے جانا نہیں چاہتے تو وہ ان سے لپٹ گئے اور ساتھ چلنے کی پُر زور خواہش کی۔ ابوطالب کو بھی ان کی جدائی

گوارا نہ تھی آخر انہیں ساتھ لے جانے پر آمادہ ہو گئے۔

واللہ لاخرجنی بہ معی ولا یفارقنی ولا افارقہ ابدا	خدا کی قسم میں انہیں ساتھ لے جاؤں گا اور ہم کبھی ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے۔

(تاریخ خمیس۔ج۱۔صفحہ۲۵۷)

جناب ابو طالب نے انہیں ساتھ لے لیا اور شام کی طرف روانہ ہو گئے۔ جب ان کا تجارتی قافلہ شام کے جنوبی حصہ میں پہنچا تو وہاں کے ایک راہب جرجیس ابن ابی ربیعہ نے جو بحیرا کے نام سے مشہور ہے آنحضرتؐ کو اس قافلہ میں دیکھا اور ان سے ایسے آثار مشاہدہ کئے جو نبی خاتم کے لئے مخصوص تھے۔ اس نے انہیں قریب سے دیکھنے کے لئے تمام اہلِ قافلہ کو اپنے یہاں دعوت دی۔ قریش نے آنحضرتؐ کو سامان کے پاس چھوڑا اور اس کے ہاں پہنچ گئے۔ بحیرا نے جب آنحضرتؐ کو نہ دیکھا تو پوچھا کہ کوئی اور بھی ہے؟ کہا کہ صرف ایک بچہ باقی رہ گیا ہے جسے سامان کی حفاظت کے لئے چھوڑ آئے ہیں۔ کہا کہ اسے بھی بلا یا جائے۔ جب آنحضرتؐ تشریف لائے تو بحیرا نے انہیں سر سے پیر تک بغور دیکھا اور پشت مبارک سے پیراہن ہٹا کر مہر نبوت پہ نگاہ کی اور اُن سے خواب و بیداری کی مختلف باتیں دریافت کرنے کے بعد ابو طالب سے پوچھا کہ یہ بچہ آپ کا کیا ہوتا ہے؟ ابو طالب نے کہا کہ میرا بیٹا ہے۔ بحیرا نے کہا کہ یہ آپ کا بیٹا تو ہو نہیں سکتا۔ اور ان کے سراپا پر نظر کرنے کے بعد میں کہہ سکتا ہوں کہ ان کے والد کو زندہ نہ ہونا چاہیئے۔ ابو طالب نے کہا کہ یہ میرا بھتیجا اور میرا پروردہ ہے۔ ان کے والد کا انتقال ان کی پیدائش سے پہلے ہی ہو چکا ہے۔ بحیرا نے کہا کہ انہیں یہیں سے واپس لے جائیے ایسا نہ ہو کہ یہود ان کے درپے آزار ہوں اور انہیں گزند پہنچائیں۔ یہ ہدایت کے پیغامبر اور نبی مرسل ہیں۔ اہلِ قافلہ میں سے کچھ لوگوں نے پوچھا کہ تم نے کیونکہ جانا کہ یہ نبی و رسول ہوں گے۔ کہا کہ جب تمہارا قافلہ پہاڑ کی بلندی سے نیچے اتر رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ تمام درخت اور پتھر سجدے میں جھک گئے ہیں اور جدھر یہ بچہ جاتا ہے ابر سایہ کئے ہوئے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے خدوخال شکل و شمائل اور حسب نسب کا تذکرہ میں نے آسمانی صحیفوں میں پڑھا ہے۔ اس بنا پر کہتا ہے کہ یہ اللہ کے رسولؐ اور سردارِ انبیاءؑ ہیں۔

"سالے کہ نکوست از بہارش پیدا"

جب آنحضرتؐ کا سن بیس برس کا ہوا تو ایک دن انہوں نے ابو طالب سے ذکر کیا کہ میں خواب میں تین نورانی پیکروں کو دیکھتا ہوں کہ اُن میں سے ایک میری طرف اشارہ کر کے اپنے دونوں ساتھیوں سے کہتا ہے کہ یہ ہے وہ جس کی نصرت وقت آنے پر تمہیں کرنا ہو گی اور اس کے علاوہ کوئی بات نہیں کرتا۔ ابو طالب نے

مکہ کے ایک عالم سے اس کا تذکرہ کیا۔ اس نے آنحضرتؐ کو غور سے دیکھا اور کہا کہ خدا کی قسم یہ پاکیزہ روح کے حامل اور پاکیزہ نبی ہیں۔ ابو طالب نے اس سے کہا کہ چپ رہیے اور اسے ظاہر نہ کیجئے۔ ایسا نہ ہو کہ انہی کی قوم رشک وحسد کی بنا پر ان کی دشمن ہو جائے۔ تم نے جو کہا ہے صحیح کہا ہے اور میں اس سے بے خبر نہیں ہوں۔

لقد انبأنی ابی عبد المطلب بانه النبی المبعوث وامرنی ان استر ذٰلك لئلا یغری به الاعادی۔

(تاریخ یعقوبی۔ ج ۲۔ ص ۱۴)

میرے والد عبد المطلب مجھے بتا گئے تھے کہ یہ اللہ کے بھیجے ہوئے نبی ہیں اور مجھے ہدایت کی تھی کہ میں اس بات کو پردۂ خفا میں رکھوں تاکہ دشمن اس کے خلاف نہ بھڑک اٹھیں۔

یہ واقعات وحالات ابو طالب کے لئے تصدیقِ نبوت کی راہیں ہموار کر چکے تھے۔ اور آفتاب نبوت کے برافگندہ نقاب ہونے سے پہلے ان کے دل پر پرتو رسالت کی چھوٹ پڑ رہی تھی۔ اور وہ علم الیقین رکھتے تھے کہ یتیم عبداللہ مستقبل کے نبی ہیں۔ اسی لئے ان کی خدمت، تربیت اور دیکھ بھال میں مادی مسرت سے کہیں زیادہ روحانی کیفیت وسرور محسوس کرتے پروانہ وار اُن کے گرد وپیش رہتے، شب وروز انہیں نظروں میں رکھتے اور اُن کی فلاح وبہبود میں کوشاں رہتے۔ آنحضرتؐ بچپن کے حدود سے نکل کر جوان ہو چکے تھے۔ اب ابو طالب کو تربیت کے ضمن میں ان کے روزگار ومعیشت کی فکر ہوئی۔ قریش کا ذریعہ معیشت تجارت تھا مگر سرمایہ نہ ہونے کی وجہ سے کوئی کاروبار نہ کیا جا سکتا تھا۔ اس وقت مکہ میں ایک معزز خاتون خدیجہ بنت خویلد تھیں۔ جو خرید وفروخت کے لئے اپنے کارندے دوسرے شہروں میں بھیجا کرتی تھیں۔ آپ نے آنحضرتؐ کو خدیجہ کا کاروبار سنبھالنے کا مشورہ دیا اور خود جناب خدیجہ سے جا کر کہا کہ وہ جن شرائط پر دوسروں کو مالِ تجارت دے کر بھیجتی ہیں محمّد ابن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو بھی بھیجیں۔ خدیجہ نے اسے منظور کر لیا اور شرائط تجارت طے کرنے کے بعد مالِ تجارت آنحضرتؐ کے سپرد کیا۔ آپ کچھ عرصہ ان کا کاروبار کرتے رہے اور اس میں انتہائی کامیابی حاصل کی۔ خدیجہ ان کے کاروبار سے مطمئن اور ان کی دیانت، راستبازی وخوش معاملگی سے بہت متاثر ہوئیں اور انہیں کسی ذریعہ سے شادی کا پیغام بھجوایا۔ آپ نے اپنے چچا ابو طالب کے مشورہ کرنے کے بعد اس رشتہ کو منظور فرمایا۔ ابتدائی مراحل طے ہونے کے بعد ابو طالب، حمزہ، عباس اور دوسرے بنی ہاشم واکابر قریش کے ہمراہ حضرت خدیجہ کے مکان پر آئے۔ بزم عقد آراستہ ہوئی اور جناب ابو طالب نے خطبۂ نکاح پڑھا:۔

الحمد لله الذی جعلنا من ذریة ابراهیمؑ وزرع اسمٰعیلؑ وضعضئ معد وعنصر مضر وجعلنا حضنة

تمام حمد اس اللہ کے لئے ہے جس نے ہمیں ذریت ابراہیم اور نسلِ اسمٰعیل اولادِ معد اور صلب مضر سے پیدا کیا اور ہمیں اپنے گھر کا نگہبان اور اپنے حرم

بيته وسواس حرمه وجعله لنا
بيتا محجوجا وحرما آمنا وجعلنا
حكام الناس ثم ان ابن اخي هذا
محمد ابن عبد الله لا يوزن به
رجل الا رجح به شرفا وفضلا
وعقلا وان كان في المال قل
فان المال ظل زائل وامر حائل
وعارية مسترجعة وهو والله
بعد هذا له نبأ عظيم وخطر
جليل۔ (سیرت حلبیہ۔ ج ۱۔ ص ۱۳۹)

کا پاسبان بنایا اور اسے ہمارے لئے حج کا مقام
اور جائے امن و قرار دیا اور ہمیں لوگوں پر حاکم
بنایا۔ یہ میرے بھتیجے محمد ابن عبد اللہ ہیں، جس
کسی سے ان کا مقابلہ و موازنہ کیا جائے گا، تو
شرف و نجابت اور عقل و فضیلت سے ان کا پلہ
بھاری رہے گا۔ اگرچہ دولت ان کے پاس کم ہے
لیکن دولت تو ایک ڈھلتی ہوئی چھاؤں، پلٹ
جانے والی چیز اور واپس لے لی جانے والی عاریت
ہے۔ خدا کی قسم! ان کا مستقبل عظمت بکنار اور
ان سے ایک عظیم خبر کا ظہور ہوگا۔"

یہ خطبہ اگرچہ مختصر ہے اس سے ان کے عقائد و نظریات اور آنحضرتؐ کے متعلق ان کے خیالات کا بڑی حد تک اندازہ ہو جاتا ہے۔ انہوں نے خطبہ کی ابتداء اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا سے کی ہے جس سے اُن کی توحید پرستی پر روشنی پڑتی ہے۔ حمد و ثنا کے بعد ذریتِ ابراہیمی و نسلِ اسمٰعیلی سے اپنی وابستگی کا اظہار کر کے خانہ کعبہ کی نگرانی، حرم کی پاسبانی اور عامۃ الناس پر حکمرانی کا ذکر کیا ہے۔ اس سے صرف یہی امر واضح نہیں ہوتا کہ وُہ نسلِ ابراہیمؑ میں سے ہونے کی بنا پر ان منصبوں اور عہدوں پر فائز ہوتے چلے آ رہے تھے، بلکہ اس امر کی بھی نشاندہی ہوتی ہے کہ وہ حرم کے عہدوں کے علاوہ ان کے تعلیمات کے بھی ورثہ دار تھے۔ اگر وہ اُن کے تعلیمات سے بیگانہ اور ان کے دین و آئین سے بے تعلق ہوتے تو اس انتساب پر فخر کا کوئی مورد ہی نہ تھا۔ اس شرفِ انتساب اور خصوصی امتیازات کے بعد آنحضرت کے کمالِ فہم و فراست اور بلندیٔ عقل و دانش کا تذکرہ کیا ہے اور ان کے محاسن و کمالات کے مقابلہ میں مالِ دنیا کی بے قدری و بے وقعتی کو واضح کیا ہے اس طرح کہ اسے ڈھلتے ہوئے سایہ سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی جس طرح سایہ اپنا کوئی مستقل وجود نہیں رکھتا اور اس کا گھٹنا، بڑھنا، سمٹنا، پھیلنا دوسری شے کے تابع ہوتا ہے اسی طرح مالِ دنیا بھی غیر مستقل اور عارضی ہے۔ آج ایک کے پاس ہے اور کل دوسرے کے پاس۔ لہٰذا اس مال کے ذریعہ جو عزت و سربلندی حاصل ہوگی۔ وُہ سایہ کے مانند ناپائیدار ہوگی۔ آخر میں نبأ عظیم کے الفاظ سے آنحضرتؐ کے درخشندہ مستقبل، علو منزلت اور عالمگیر نبوت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ وہ عنقریب آسمانِ ہدایت پر نیّر درخشاں بن کر چمکیں گے اور اپنے تعلیمات کی روشنی میں بھٹکی ہوئی انسانیت کو سیدھی راہ دکھائیں گے۔

جب آنحضرت کاروانِ حیات کی چالیس منزلیں طے کر چکے تو قدرت نے جس مقصد کے لئے انہیں خلق کیا تھا اس مقصد کی تکمیل کے لئے مامور فرمایا اور ہدایت عالم کا بار گراں ان کے کاندھوں پہ رکھا۔ آپ کفر و شرک کی گھٹا ٹوپ اندھیاریوں میں ہدایت کے دیے جلانے اور اسلام کا پیغام گھر گھر پہنچانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ بعثت کے ابتدائی سالوں میں دائرہ تبلیغ محدود اور دعوتِ اسلام بڑی حد تک مخفی تھی۔ گنے چنے چند افراد کے علاوہ دوسروں سے اظہار اسلام میں احتیاط برتی جاتی تھی۔ نماز کے لئے تنہائی کے مواقع ڈھونڈے جاتے تھے کبھی مکانوں میں چھپ کے عبادت کرتے اور کبھی حضرت علیؑ کو ساتھ لے کر پہاڑوں کی کھائیوں کی طرف نکل جاتے اور وہاں نماز ادا کرتے۔ ایک مرتبہ ابو طالب نے ان دونوں کو پہاڑ کی ایک کھائی میں نماز پڑھتے دیکھ لیا۔ آپ نے علیؑ کو بلایا اور ان سے پوچھا کہ یہ کون سا دین ہے؟ جو تم نے اختیار کیا ہے۔ کہا کہ میں اللہ اور اس کے رسول محمد ابن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دین پر ہوں۔ ابو طالب نے یہ سنا تو کہا:۔

انہ لا یدعوك الا الی خیر فالزمہ — تم ان سے چمٹے رہو یہ تمہیں نیکی و ہدایت ہی کی راہ بتائیں گے۔"

(تاریخ طبری۔ ج ۲۔ ص ۵۸)

اگر ابو طالب کفر پسند اور اسلام دشمن ہوتے تو آنحضرت سے یہ کہتے کہ میں نے بیشک اپنے فرزند کو آپ کے حوالے کیا تھا لیکن یہ آئینِ اخلاق و مروّت کے خلاف ہے کہ آپ مجھ سے پوچھے بغیر میرے بچے کی ذہنی ناپختگی سے فائدہ اٹھائیں اور اسے اپنے نئے مذہب کی راہ پر لگائیں اور اس طرح باپ بیٹے کے درمیان ذہنی و نظریاتی تفرقہ ڈالیں، اور علی سے بھی یہ کہتے کہ تم اس اُٹھا بیٹھی کو چھوڑو اور اپنے باپ کے دین و آئین پہ قائم رہو۔ اس لئے کہ ہر انسان اپنی اولاد کو اسی دین و مذہب پر دیکھنا چاہتا ہے جس کا وہ خود پابند ہوتا ہے۔ مگر ابو طالب نے پیغمبرؐ کو کچھ کہنے یا علی کو روکنے کی بجائے انہیں آنحضرتؐ کی پیروی کا حکم دیتے ہیں۔ یہ اس امر کا واضح ثبوت ہے، کہ وہ کفار و مشرکین کے مشرکانہ عبادات و رسوم کو پسندیدہ نظروں سے نہ دیکھتے تھے ورنہ بت پرستی کے مقابلہ میں اس طرزِ عبادت کو خیر سے تعبیر نہ کرتے اور علیؑ سے یہ نہ کہتے کہ محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے طریق و مسلک پر مضبوطی سے جمے رہو وہ تمہیں نیکی اور بھلائی ہی کا راستہ دکھائیں گے۔ اس سے یہ حقیقت بڑی حد تک آشکارا ہو جاتی ہے کہ ابو طالب ذہنی طور پر اسلام سے پورے ہم آہنگ اور ہمہ تن اس کی پذیرائی کے لئے آمادہ تھے۔

آنحضرتؐ کو در پردہ تبلیغ کرتے ہوئے تین برس گزر گئے۔ جب چوتھا سال شروع ہوا تو علانیہ تبلیغ اسلام کا حکم آیا۔ آپ نے ابو طالب کے مکان پر ایک دعوت کا اہتمام کیا اور اپنے عزیز و اقارب کو جمع کر کے انہیں اللہ کا پیغام سنایا کہ وہ بتوں کو چھوڑ کر خدائے واحد کی پرستش کریں۔ ابو طالب قریش کے تیوروں سے سمجھ رہے تھے کہ وہ اپنے قدیم رسم و رواج کے خلاف کوئی آواز سننا گوارا نہ کریں گے۔ اور لا محالہ آنحضرت کے خلاف اُٹھ

کھڑے ہوں گے آپ نے ان کی مخالفت کے زور پکڑنے سے پہلے یہ مناسب سمجھا کہ ان کے گوش گزار کر دیں کہ وہ ابن عبداللہ کو تنہا و بے سہارا نہ سمجھیں بلکہ ہم اُن کے دست و بازو بن کر اُن کے ساتھ ہوں گے اور ہر لمحہ اُن کے سینہ سپر رہیں گے۔ چنانچہ آپ نے جذبۂ حق پرستی سے متاثر ہو کر پُر اعتماد لہجے میں کہا:۔

واللہ لنمنعہ ما بقینا۔! (تاریخ کامل ج ۱۔ ص ۴۱)

خدا کی قسم ہم جب تک زندہ رہیں گے دشمنوں سے اُن کی حفاظت کریں گے"

جب پیغمبر اکرمؐ کی آواز گھر کی چار دیواری سے نکل کر کفر پر در فضا میں گونجی تو ردّ عمل کے طور پر مخالفت کے طوفان اُٹھ کھڑے ہوئے۔ جو لوگ دیدہ و دل فرش راہ کرتے تھے آنکھیں دکھانے اور جو پھول برساتے تھے۔ کانٹے بچھانے لگے۔ قریش نے قدم قدم پر تبلیغ حق میں مشکلات پیدا کیں۔ وہ کون سی رکاوٹ تھی جو آپ کے راستے میں کھڑی نہ کی ہو اور وہ کون ساحربہ تھا جو اٹھا رکھا ہو۔ مگر پیغمبرؐ نے کسی مشکل کو مشکل نہ سمجھا اور قریش کی معاندانہ سرگرمیوں کے باوجود ہمہ تن اپنے تبلیغی کاموں میں مصروف رہے۔ قریش نے یہ صورت حال دیکھی تو وہ ایک وفد کی صورت میں ابوطالب کے پاس آئے اور کہا کہ آپ فرزند عبداللہ کے طور طریقے دیکھ رہے ہیں انہوں نے چند کم حیثیت لوگوں کو بہلا پھسلا کر اپنے دین میں داخل کر لیا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اُن سے رُد در رُو بات چیت کریں اور آپ بھی انہیں سمجھائیں کہ وہ اپنا رویہ بدلیں اور اس نئی اپج سے باز آئیں۔ ابوطالب اٹھ کر آنحضرتؐ کے پاس آئے اور کہا کہ چند رؤسائے قریش آپ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں اگر مناسب سمجھیں تو ان کی بات سن لیں۔ آنحضرتؐ باہر تشریف لائے اور اُن لوگوں سے پوچھا کہ کیا کہنا چاہتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ ہم یہ بات آپ کے گوش گزار کرنا چاہتے ہیں کہ آپ ہمارے بتوں سے کوئی سروکار نہ رکھیں۔ انہیں بُرا بھلا نہ کہیں اور نہ ہمارے دین و مذہب پر حملہ کریں۔ اگر آپ نے ہمارا یہ مطالبہ مان لیا تو ہم آپ کے کسی کام میں دخل نہیں دیں گے آپ جانیں آپ کا کام۔ فرمایا میں یہی تو چاہتا ہوں کہ اللہ ایک ہے اسی کی عبادت کرو اور اُسے چھوڑ کر اپنے خود ساختہ خداؤں کی پرستش نہ کرو۔ اور یہ میرا فرض منصبی ہے کہ میں بت پرستی کی مذمت اور خدا پرستی کی تبلیغ کروں۔ قریش نے کہا کہ یہ تو عجیب بات ہے کہ ہم اپنے باپ دادا کے مسلک کو چھوڑ کر اور تمام معبودوں سے منہ موڑ کر بس ایک خدا کے ہو رہیں۔ یہ کہہ کر تیوریوں پر بل ڈالے اور منہ لٹکا کر چل دیے۔

اس موقع پر ابوطالب نے اپنی حکمت عملی اور حسن تدبر سے کام لیتے ہوئے ایسا رویہ اختیار کیا کہ قریش کے بھڑکے ہوئے جذبات اور بھڑکنے نہ پائیں۔ اگر نرم روی کے بجائے سخت رویہ اختیار کیا جاتا تو دشمنی و عناد کی آگ بھڑک اٹھتی اور کفار کی تشدد پسند طبیعتیں اور سختی و تشدد پر اُتر آتیں۔ اس مصلحت کے علاوہ دعوت فکر کا اہم مقصد بھی اس میں شامل تھا کہ قریش سیخ پا ہونے کے بجائے ٹھنڈے دل سے آنحضرتؐ کی باتیں

سنیں، اُن پر غور کریں اور اپنے معتقدات اور اُن کے تعلیمات کا جائزہ لے کر حق و باطل کا فیصلہ کریں اور جس طرح دوسرے معاملات میں ان کی راستگوئی و صدق بیانی تسلیم کرتے آئے ہیں، دین کے بارے میں بھی اُن کی سچائی کا اعتراف کریں اور سوچیں کہ جس نے چالیس سال کی عمر تک نہ کبھی جھوٹ بولا ہو اور نہ کبھی غلط بیانی کی ہو وہ یکبارگی اتنا بڑا جھوٹ کیسے بول سکتا ہے کہ رسالت اور اللہ کی نمائندگی کا ادعا کرنے لگے۔ مگر قریش اپنے معتقدات سے دستبردار ہونے کو تیار نہ تھے اور نہ ان کی منجمد طبیعتوں میں بآسانی تبدیلی ہو سکتی تھی۔ انہوں نے دیکھا کہ ان کے عقائد کا تحفظ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب اس داعیٔ حق کا خاتمہ کر دیا جائے۔ مگر ابوطالب کے ہوتے ہوئے انہیں آنحضرتؐ پر حملہ کرنے کی جرأت بھی تو نہ تھی۔ انہوں نے ابوطالب کی حمایت و سرپرستی کو ختم کرنے کے لئے یہ کھیل کھیلا کہ قریش کے ایک خوبصورت نوجوان عمارہ ابن ولید کو ابوطالب کے پاس لائے اور کہا کہ آپ اسے اپنا بیٹا بنا لیجئے اور محمدؐ کی حمایت سے دستبردار ہو جائیے۔ ابوطالب نے ان کی یہ انوکھی فرمائش سنی تو فرمایا:۔

اتعطوننی ابنکم اغذوہ لکم و اعطیکم ابنی تقتلونہ ھٰذا واللہ لایکون ابدا۔ (تاریخ کامل ج ۲ ص ۴۳)	یہ اچھا انصاف ہے کہ میں تمہارے بیٹے کو لے کر پالوں اور اپنا بیٹا تمہارے حوالے کر دوں تاکہ تم اسے قتل کرو۔ خدا کی قسم یہ کبھی نہیں ہوگا۔"

قریش کا یہ مطالبہ انسان کے فطری لگاؤ اور جذبۂ محبت سے بے خبری یا اس سے عمداً بے رخی پر مبنی تھا کہ ابوطالب اپنے حقیقی بھتیجے اور پروردہ کو خونخوار درندوں کے حوالے کر دیں اور ایک اجنبی اور بیگانے کو لے کر پالیں پوسیں۔ ایک معمولی سطح کا انسان بھی اسے گوارا نہیں کر سکتا چہ جائیکہ ابوطالب ایسا باحمیت انسان جو پناہ مانگنے والوں کے لئے بھی مضبوطی و تندہی سے جم جاتا ہو وہ اپنے جگر بند کو اس آسانی سے خون آشام تلواروں کے سپرد کر دے اور اپنی حمیت، مروّت اور شرف کا کچھ بھی پاس و لحاظ نہ کرے۔

قریش کی اس پیشکش سے اُن کی پست ذہنیتوں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ آنحضرتؐ کی دشمنی میں کس حد تک ہوش و خرد کے تقاضوں سے دور ہو چکے تھے کہ ایسی پوچ اور بے طرح باتوں پر اُتر آئے تھے۔ یہ امر غور طلب ہے کہ ایسے کج فکر لوگوں کو سمجھانا بجھانا اور ان کے ارادوں کو ناکام بنانا کتنا دشوار تھا۔ اور ان دشواریوں کے دور کرنے میں کیا ابوطالب کے علاوہ کسی اور کا بھی عمل دخل تھا؟ تاریخ کسی اور کا نام بتانے سے قاصر ہے۔ غرض قریش کا یہ حربہ بھی ناکام ہو گیا اور ان کی سخت گیریوں اور ستم رانیوں کے باوجود اسلام کی آواز دبنے کے بجائے ابھرتی ہی گئی۔ اب انہیں یہ فکر لاحق ہوئی کہ اگر آنحضرتؐ کی آواز سے متاثر ہو کر لوگ اسی طرح دائرۂ اسلام میں داخل ہوتے رہے اور یہ سلسلہ یونہی بڑھتا رہا تو یہ مختصر جماعت آگے بڑھ کر مکہ کی سیاست

پر چھا جائے گی اور انہیں پیروں تلے روند کر اُن کے اقتدار کو ملیامیٹ کر دے گی۔ جب انہیں انقلابِ نو کے زیرِ اثر اپنا اقتدار خطرہ میں نظر آیا تو ان کے چند شیوخ و عمائد ابو طالب کے پاس پھر آئے اور کہا کہ ہم پہلی مرتبہ تو خاموش چلے گئے تھے مگر اب ہمارا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا ہے۔ ہم کہاں تک آپ کی بزرگی و عظمت کا پاس و لحاظ کریں گے آخر ہم کو وہ قدم اٹھانا پڑے گا جو اب تک اس توقع پر نہیں اٹھایا کہ شاید یہ آواز دب جائے مگر یہ آواز خود سے دبتی نظر نہیں آتی۔ آپ اپنے بھتیجے کو سختی سے سمجھائیں کہ وہ خاموش بیٹھ جائیں اور ان ان آسمانی باتوں کا سلسلہ ختم کریں۔ ورنہ آپ درمیان سے ہٹ جائیں اور ہمیں دو ٹوک فیصلہ کر لینے دیں۔ ابو طالب نے اُن کے بُرے ارادے اور بگڑے ہوئے تیور دیکھے تو گھبرائے ہوئے آنحضرتؐ کے پاس آئے اور کہا کہ سردارانِ قریش پھر جتھا باندھ کر آئے ہیں۔ آپ ایسا طریق اختیار کریں کہ اُن کے جذبات مشتعل نہ ہوں۔ ورنہ اندیشہ ہے کہ وہ اچانک آپ کو قتل کر دیں گے۔ میں ایک اکیلا کہاں تک اُن کا مقابلہ کر سکتا ہوں اور ان کی بڑھتی ہوئی طغیانی و سرکشی کو روک سکتا ہوں۔ آنحضرتؐ نے ابو طالب کی زبان سے یہ الفاظ سنے تو آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور بھرائی ہوئی آواز میں فرمایا:۔ چچا میں تو انہیں نیکی اور خدا پرستی کی دعوت دیتا ہوں اور میرے منصب کا تقاضا یہی ہے کہ میں انہیں اللہ کے احکام بتاؤں، ناشائستہ اعمال سے روکوں۔ اگر وہ لوگ میرے ایک ہاتھ پر سورج اور دوسرے ہاتھ پر چاند لا کر رکھ دیں، جب بھی میں اعلانِ حق اور ادائے فرض سے دستبردار نہیں ہو سکتا۔ یہ کہہ کر آپ وہاں سے چل دیے۔ ابو طالب نے پیغمبرؐ کو جاتے دیکھا تو بوڑھے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا۔ آواز دے کر پیغمبرؐ کو روکا اور ان کے عزم و استقلال سے متاثر ہو کر پوری خود اعتمادی سے کہا:۔

اذھب یابن اخی فقل ما احببت فو اللہ لا اسلمك لشیئ ابدا۔ (تاریخ طبری۔ ج ۲۔ ص۶۷)	برادر زادے جائیے اور جو چاہے کہیئے۔ خدا کی قسم میں کبھی آپ کا ساتھ نہیں چھوڑوں گا۔"

ابو طالب کے اس جرأت آفرین جواب سے پیغمبرؐ کے آنسو پنچھ گئے۔ پُرعزم دل کا حوصلہ بڑھ گیا اور تنہائی و بے یاری کا احساس جاتا رہا۔ اس تجدید عہد کے بعد ابو طالب نے قریش کی طرف رُخ کیا اور کہا کہ آپ لوگ کیا کھڑے ہیں جائیے:۔

واللہ ماکذب ابن اخی قط (اصابہ۔ ج ۴۔ ص۱۱۶)	خدا کی قسم! میرے بھتیجے کی زبان کبھی جھوٹ سے آشنا نہیں ہوئی۔"

قریش کے ان وفدوں میں اگرچہ ابو طالب کو ایک واسطہ و ذریعہ ٹھہرایا جاتا رہا ہے مگر وہ کسی موقع پر قریش کے مسلک کی تائید و ہمنوائی کرتے نظر نہیں آتے۔ اگر وہ ان کے نظریات کے ہمنوا ہوتے تو جہاں پیغمبر کو قریش کا

پیغام پہنچانے تھے۔ وہاں یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ آپ ان کے مذہب کے خلاف کچھ نہ کہیں اور نہ بتوں کی مذمت کریں
آخر میں بھی انہی کے مذہب و آئین پر ہوں۔ مگر تاریخ یہ بتانے سے قاصر ہے کہ آپ نے کبھی اُن کی ہمنوائی کی
ہو۔ بلکہ صرف ایک پیغامبر کی حیثیت سے پیغام پہنچا دیتے تھے اور کچھ کہتے بھی تھے تو قریش کے خلاف پڑتا تھا
قریش بھی ان کے طرزِ عمل سے سمجھ گئے تھے کہ ان کی تمام ہمدردیاں اپنے بھتیجے کے ساتھ ہیں اور ان سے کبھی یہ
امید نہیں کی جاسکتی کہ وہ آنحضرتؐ کی نصرت وحمایت سے دستبردار ہو کر ان کا ساتھ چھوڑ دیں گے۔ لہٰذا انہوں
نے مزید کچھ کہنا سننا بے سود سمجھا اور ایک محاذ قائم کر کے پیغمبر اکرمؐ کو ستانا اور اذیتیں دینا شروع کر دیں۔ کبھی ڈھیلے
مارتے، کبھی کوڑا کرکٹ پھینکتے، کبھی کاہن ومجنوں اور آسیب زدہ کہتے، اور جب آپ نماز کے لئے کھڑے ہوتے
تو آوازے کستے اور مذاق اڑاتے۔

پیغمبر اکرمؐ ایک دن خانہ کعبہ کے پاس مصروفِ نماز تھے کہ ابوجہل نے حرم میں بیٹھے ہوئے چند آدمیوں
سے کہا کہ تم میں کون ہے جو ان کی نماز خراب کرے۔ عبداللہ ابن الزبعری اُٹھا اور خون اور گوبر لے کر آپ
کے چہرۂ اقدس پر مل دیا۔ آنحضرتؐ نماز سے فارغ ہوئے تو سیدھے ابوطالب کے پاس آئے۔ اور ان کے سوا کون
تھا جو ان کی حالت پر کڑھتا اور دکھ درد سنتا۔ ابوطالب نے پیغمبر کی یہ حالت دیکھی تو ان کا خون کھولنے
لگا۔ پوچھا کہ یہ کس کی حرکت ہے؟ فرمایا عبداللہ ابن الزبعری کی۔ ابوطالب نے تلوار ہاتھ میں لی اور خانہ کعبہ
کی طرف چل دیے۔ عبداللہ ابن الزبعری اور دوسرے لوگوں نے جیسے ہی ابوطالب کو آتے دیکھا تو کھسکنا چاہا۔
آپ نے گرج کر کہا کہ اگر تم میں ایک بھی اپنی جگہ سے ہلا تو اس کی جان کی خیر نہیں ہے۔ یہ سن کر وہ جہاں بیٹھے
تھے وہیں دبک کر بیٹھ گئے۔ آپ نے خون اور گوبر لے کر ایک ایک کے چہرے پر ملا اور نفرین وملامت کرتے
ہوئے واپس آئے۔

ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ پیغمبر اکرمؐ شام تک گھر نہ پلٹے۔ ابوطالب کو فکر دامن گیر ہوئی کیونکہ ان حالات
میں یہ اندیشہ تھا کہ قریش آنحضرتؐ کو کہیں غائب کر دیں یا قتل کر ڈالیں۔ آپ نے جہاں جہاں آنحضرتؐ کے ملنے
کا امکان تھا ڈھونڈھ ڈالا مگر کہیں پتہ نہ چل سکا۔ آپ نے چند ہاشمی نوجوانوں کو بلایا اور ان سے کہا کہ تم اپنی
آستینوں میں تیز دھار خنجر چھپا کر سردارانِ قریش میں سے ایک ایک کے پہلو میں بیٹھ جاؤ اور ایک ابوجہل کے
کے پاس۔ اگر یہ سنو کہ محمدؐ قتل کر دیئے گئے ہیں تو تم ایک دم ان پر ٹوٹ پڑنا اور سب کو بے دریغ قتل کر دینا۔
ہاشمی نوجوانوں نے خنجر سنبھالے اور سردارانِ قریش کو اپنی زد میں لے کر بیٹھ گئے۔ ابوطالب تلاش میں سرگرداں تھے
کہ کوہِ صفا کی جانب سے زید ابن حارثہ کو آتے دیکھا پوچھا کہ تم نے میرے بھتیجے کو کہیں دیکھا ہے؟ کہا کہ ہاں
میں ابھی ابھی ان کے پاس سے آرہا ہوں۔ وہ کوہِ صفا کے دامن میں تشریف فرما ہیں۔ فرمایا انہیں ابھی بلا کر

لاؤ۔ میں جب تک انہیں زندہ و سلامت دیکھ نہ لوں گا گھر واپس نہیں جاؤں گا۔ زید نے آنحضرتؐ کو ابوطالب کی پریشانی کی خبر دی۔ آپ فوراً اٹھ کر چچا کے پاس آئے۔ ابوطالب نے انہیں صحیح و سالم دیکھا تو اطمینان ہوا۔ دوسرے دن آپ پیغمبر اکرمؐ اور ہاشمی نوجوانوں کو لے کر قریش کے پاس آئے اور ان نوجوانوں سے کہا کہ جو چیز تم چھپائے ہوئے ہو اسے ظاہر کر دو۔ سب نے آستینوں سے خنجر نکال کر دکھائے۔ قریش نے پوچھا کہ یہ خنجر کیسے ہیں؟ کہا کہ کل محمدؐ دن بھر غائب رہے۔ مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں وہ قتل نہ کر دیئے گئے ہوں۔ میں نے ان ہاشمی نوجوانوں کو مامور کیا تھا کہ اگر محمدؐ (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) کے قتل کی خبر آئے تو سرداران قریش پر حملہ کر دینا۔ اور ان میں سے کسی ایک کو بھی زندہ نہ چھوڑنا۔ لہٰذا ان تیز دھار خنجروں کو اچھی طرح دیکھ بھال لو۔

واللّٰہ لو قتلتموہ ما بقیت منکم احدا حتی نتفانی نحن وانتم۔

(طبقات ابن سعد۔ ج ۱۔ ص ۲۰۳)

اگر تم محمدؐ کو قتل کر دیتے تو خدا کی قسم! میں تم میں سے ایک کو بھی زندہ نہ چھوڑتا۔ ہم بھی مرجاتے اور تمہیں بھی موت کے گھاٹ اتار دیتے۔"

قریش اور بنی ہاشم میں رقیبانہ چشمک تو پہلے ہی سے تھی اور اب ان کی معاندانہ روش کے نتیجہ میں اختلاف کی خلیج وسیع سے وسیع تر ہوگئی اور ان کی دشمنی و عداوت کھل کر سامنے آگئی۔ قریش کا عناد اس حد تک بڑھا کہ انہوں نے بنی ہاشم سے قطع مراسم کا فیصلہ کر لیا اور انہیں مجبور کر دیا کہ وہ شہر سے باہر ایک گھاٹی میں پناہ لیں۔ یہ مقام بھی قریش کی پہنچ سے باہر نہ تھا اور ہر وقت یہ خطرہ رہتا تھا کہ اچانک کسی سمت سے حملہ نہ ہو جائے۔ اور رات کے وقت یہ خطرہ اور بڑھ جاتا تھا۔ اس خطرہ کے پیش نظر ابوطالب راتیں جاگ کر کاٹتے، پیغمبرؐ کے بستر پر اپنے بچوں میں سے کسی کو اور علی العموم اپنے چھوٹے فرزند علیؑ کو سلا دیتے تاکہ رات کے اندھیرے میں حملہ ہو تو ان کا کوئی بیٹا کام آجائے اور پیغمبرؐ پر آنچ نہ آئے۔ یہ دور وہ تھا جب خطہ عرب میں گنے چنے چند آدمیوں کے علاوہ پیغمبرؐ کا نہ کوئی حامی تھا اور نہ کوئی مددگار کیا اپنے اور کیا بیگانے سب ہی دشمنی پر آمادہ اور مخالفت پر تلے ہوئے تھے۔ اس سخت ترین دور میں ایک ابوطالب تھے جو پیغمبرؐ کی حمایت و پشت پناہی پر کوہ آسا جمے رہے نہ کسی موقع پر ان کا ساتھ چھوڑا اور نہ ان کی نصرت و اعانت سے ہاتھ اٹھایا۔ یہ انہی کی حمایت و پاسداری کا نتیجہ تھا کہ قریش اپنے ارادوں کو عملی جامہ نہ پہنا سکے اور آنحضرتؐ ان کی دسترس سے باہر اور خطروں سے محفوظ رہے۔ وہ نرمی کے موقع پر نرمی سے اور سختی کے موقع پر سختی سے دفاع کرتے رہے اور اپنے اثر و نفوذ سے کام لے کر ان کے شیطانی منصوبوں کو ناکام بناتے رہے۔ غرض کہ ہر ممکن طریقہ سے قریش کی شر انگیزیوں کو دبایا اور معاشی مقاطعہ کے باوجود اپنی اولاد کو خطرہ میں ڈال کر آنحضرتؐ کے تحفظ کا انتظام کیا۔ اگر وہ عرب کے چیرہ دستوں اور قریش کے فتنہ پردازوں کے ظلم ناروا کو روکنے کے لئے کھڑے نہ ہوتے تو مظالم قریش کی تاریخ موجودہ تاریخ سے

کہیں زیادہ دردناک والم انگیز ہوتی۔

ابوطالب کی فداکاری وجاں نثاری اور پیغمبرؐ کی نصرت وحمایت میں پامردی وہ مسلمہ حقیقت ہے کہ جس سے آج تک کسی کو انکار کی جرأت نہیں ہوسکی۔ البتہ کچھ لوگوں نے اس نصرت کو دوسرا رنگ دے کر اس کی اصل روح کو مضمحل کر دینا چاہا ہے۔ چنانچہ اس بات پر زور دیا جاتا رہا ہے کہ یہ نصرت مذہبی واعتقادی جذبہ کے زیرِ اثر نہ تھی بلکہ اس میں قرابت وعزیزداری کے جذبات کارفرما تھے۔ اور عرب تو دُور کی قرابت کو بھی نظر انداز نہ کرتے تھے اور پیغمبرؐ تو آپ کے پروردہ اور حقیقی بھتیجے تھے وہ کیونکر ان کی حمایت وپاسداری نہ کرتے اور کیوں اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر ان کے سینہ سپر نہ ہوتے۔ یہ بات اس حد تک تو صحیح ہے کہ پیغمبرؐ آپ کے قریبی عزیز، پروردۂ خاص اور حقیقی بھائی کی یادگار تھے۔ اور یہ بھی مسلّم ہے کہ عرب قرابت داری کا پاس ولحاظ کرتے تھے مگر کتنی بھی عزیزداری کیوں نہ ہو کوئی شخص اپنے مذہب کے مقابلہ میں قرابت ورشتہ داری کا خیال نہیں کرتا۔ چہ جائیکہ اپنے معتقدات کے خلاف آواز اٹھانے میں تعاون کرے اور اپنے معبودوں کی تذلیل وتوہین کے سلسلہ میں ہاتھ بٹائے۔ اور ابوطالب توبتوں کو بُرا بھلا کہنے میں پیغمبرؐ کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور اسلامی نظریات کی تبلیغ واشاعت میں انکا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ اُسے تو کسی صورت میں پاسِ قرابت کا نتیجہ نہیں قرار دیا جاسکتا۔ اور اگر یہ سب کچھ بربنائے قرابت تھا تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بیٹوں سے زیادہ قرابت ہوتی ہے یا بھتیجے سے؟ ظاہر ہے کہ جو قرابت اپنی اولاد سے ہوتی ہے وہ بھائی کی اولاد سے نہیں ہوسکتی۔ تو اگر اس نصرت میں نسبی قرابت کا تقاضا ہی کارفرما ہوتا تو بیٹوں کی جانوں کا خطرہ مُول لے کر انہیں پیغمبرؐ کے بستر پر سونے کا حکم نہ دیتے بلکہ ان کا تحفظ پیغمبرؐ کے تحفظ پر مقدم رکھتے۔ اور پھر تاریخ عالم سے ایک مثال بھی ایسی پیش نہیں کی جاسکتی کہ کسی نے ایک ایسے شخص کی خاطر جس کے نظریات کو باطل اور دعویٰ کو غلط سمجھتا ہو محض قرابت کی بناء پر اپنی اولاد کو ہلاکت میں دھکیل دیا ہو۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس نصرت میں جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے منفرد تھی قرابت کا جذبہ کارفرما نہ تھا بلکہ دینی ومذہبی رابطہ تھا جو انہیں نصرت میں سرگرمِ عمل رکھے ہوئے تھا۔ اور دین ومذہب کا رابطہ سب روابط سے قوی تر ہوتا ہے۔ اور اس کے مقابلہ میں تمام روابط مضمحل ہو جاتے ہیں۔ آخر پیغمبرؐ اور ابولہب میں بھی رشتہ تھا۔ وہ بھی پیغمبرؐ کا چچا تھا۔ وہ نسبی قرابت کی بناء پر کیوں نصرت وحمایت کے لئے کھڑا نہ ہُوا۔ یا کم از کم اس قریبی رشتہ کی بناء پر دشمنی وعناد کے مظاہروں ہی سے باز رہا ہوتا۔ اسی طرح آزر اور حضرت ابراہیم میں رشتہ تھا وہ بھی خلیلِؑ خدا کا چچا ہی تھا وہ ان کی ایذا رسانی کے کیوں درپے ہُوا۔ یونہی نوحؑ اور ان کے فرزند میں اس رشتہ سے بھی قوی تر رشتہ تھا۔ وہ کفار کی ہمنوائی میں باپ کو چھوڑ کر کیوں الگ ہو گیا۔ نوحؑ اور لوطؑ اور اُن کی بیویوں کے درمیان رشتہ تھا۔ ان میں منافرت کی خلیج کیوں حائل رہی۔ اسی لئے ناکہ ان میں مذہبی اتحاد نہ تھا۔

غرض ابوطالب کی نصرت وحمایت کو قرابت پر محمول کرکے ایک طرح سے ان پر ظلم ڈھانا اور ان کی کاوشوں اور جانفشانیوں پر پانی پھیرنا ہے۔

جناب ابوطالب کے اس طرز عمل کو دیکھنے کے بعد کہ انھوں نے اپنی زندگی کا ہر لمحہ آنحضرتؐ کی خدمت نصرت اور حمایت کے لئے وقف کر دیا۔ ہر متوازن ذہن یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ اگر وہ پیغمبرؐ کی صداقت کے قائل اور کفار و مشرکین کے عقائد و اعمال سے بیزار نہ ہوتے تو آنحضرتؐ کی نصرت و حمایت پر اس تندہی سے آمادہ نہ ہوتے اور نہ ان کی وجہ سے پرسکون زندگی کو تج کر قوم و قبیلہ اور دنیا جہاں کی دشمنی مول لیتے یہ ایک واضح ثبوت ہے کہ ان کا دل یقین کی شعاعوں سے روشن اور صدق و صفا کی ضوپاشیوں سے منور تھا اور اُن کے صفحۂ قلب پر اللہ کی وحدانیت اور پیغمبرؐ کی رسالت کے نقوش ثبت تھے اور وہ دل کی گہرائیوں سے نبوت کی تصدیق کر چکے تھے۔ اور اسی تصدیقِ قلبی و یقینِ باطنی کا نام ایمان ہے۔ چنانچہ قاضی عضدالدین نے تحریر کیا ہے:۔

فهو عندنا وعليه اكثر الائمة كالقاضي والاستاذ التصديق للرسول فيما علم مجيئه به ضرورة۔ (شرح مواقف۔ صہ ۶۱۸)

ہمارے نزدیک ایمان یہ ہے کہ اُن چیزوں میں رسُول کی تصدیق کی جائے جن کا شریعت میں وارد ہونا صراحتہً ثابت ہے اور یہی اکثر ائمہ کا مسلک ہے۔ جیسے قاضی (باقلانی) اور استاد (ابو اسحاق اسفرائنی)۔"

جب اکابر علماء و جمہور محققین کے نزدیک قلبی تصدیق اور باطنی اعتقاد ہی کا نام ایمان ہے تو پھر حضرت ابوطالب کے ایمان سے انکار کی کیا وجہ؟ جب کہ نشر اسلام، تبلیغ دین اور نصرت رسول کے سلسلہ میں ان کا کردار اُن کی تصدیقِ قلبی کا زندہ ثبوت اور ان کے ایمان کی واضح شہادت ہے۔ بلکہ اُن کے عمل و کردار اور خلوص و ایثار کی نظیر ان لوگوں میں بھی نظر نہیں آتی جنہوں نے برملا ایمان کا اقرار اور آنحضرتؐ کی رسالت کا اعتراف کیا تھا۔ پھر اظہارِ ایمان تو منافقت کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے اور ایسے لوگوں کی کبھی کمی نہیں رہی جنہوں نے زبان سے اسلام کا اقرار کیا، بڑے بلند بانگ دعوے کئے اور جب مسلمانوں پر کوئی مصیبت پڑی تو گھر کے گوشہ میں دُبکے بیٹھے رہے یا دشمنوں سے ساز باز کرتے رہے اور اس طرح اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچاتے رہے۔ سچا ایمان وہ ہے، جو دل کی گہرائیوں سے ہو نہ صرف نوکِ زباں سے۔ کیونکہ ایمان اعتقاد کا نام ہے اور اعتقاد کی منزل دل ہے نہ حنجرہ و حلق۔ اگر صرف زبانی اقرار ہی کا نام ایمان ہوتا تو ایسے ایمان لانیوالوں سے ایمان کی نفی نہ کی جاتی۔ ارشاد خداوندی ہے:۔

ومن الناس من يقول آمنا بالله وباليوم الاخر وما هم بمؤمنين۔

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو زبان سے کہتے ہیں کہ اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان لائے۔ حالانکہ وہ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔"

البتہ قلبی تصدیق اور عقیدہ وہ چیز ہے جس میں منافقت و دو رُخی کا گزر نہیں ہو سکتا۔ اور ہر عمل ایمان کا آئینہ دار اور اس کے تقاضوں کے مطابق ہوتا ہے۔ اور انہی اعمال کو دیکھ کر ایمان کا حکم لگایا جاتا ہے اس لئے کہ ایمان کے معنی یقین و اعتقاد کے ہیں۔ اور یقین اپنے اثرات سے اور اعتقاد، اعتقاد پر مرتب ہونے والے اعمال سے پہچانا جاتا ہے۔ ابوطالب کی زندگی اور اُن کے عمل و کردار پر نظر کرنے کے بعد اس سے انکار کی گنجائش نہیں ہے کہ ان کی کوششیں اسلام کے استحکام میں بنیادی پتھر کی حیثیت رکھتی ہیں۔ انہوں نے ہر طرح کی مصیبتیں سہ کر اسلام کے نشر و فروغ کی راہیں اختیار کیں اور پورے خلوص و دیانت کے ساتھ پیغمبرؐ کی خدمات و کارِ متعلقہ انجام دیتے رہے اور مشرکانہ رسوم و بت پرستی سے الگ رہ کر اسلام کی تعلیمات پر عمل پیرا رہے۔ جب وہ عملاً اسلامی احکام کے پابند اور دینِ حنیف کے پیرو تھے۔ اور ان کی زندگی کے واقعات سے اسلام دوستی اور پیغمبرؐ کی اطاعت و پیروی عیاں ہے تو پھر کسی کو یہ حق کہاں سے پہنچتا ہے کہ انہیں دائرہ اسلام سے خارج قرار دے جب کہ قرآن یہ کہتا ہے کہ اگر کسی کا طور طریقہ اسلامی اور اس کے اعمال مسلمانوں کے سے ہوں تو اُسے کفر کی زد میں نہ لے آؤ۔

ولا تقولوا لمن القیٰ الیکم السلام لست مؤمنا۔ "جو شخص تمہیں سلام کرے (اور اپنے کو مسلمان ظاہر کرے) تو تم یہ نہ کہہ دیا کرو کہ تو ایماندار نہیں ہے۔"

اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ انہوں نے علانیہ اظہارِ اسلام نہیں کیا تو جمہور علماء کے نزدیک اعلانِ اسلام شرطِ اسلام نہیں ہے خصوصاً جب کہ اسلام کے مخفی رکھنے میں کوئی مصلحت کارفرما ہو یا کوئی ضرورت اظہار سے مانع ہو چنانچہ ابتدائے بعثت میں کہ جب دعوتِ اسلام مخفی تھی پیغمبرؐ مسلمانوں کو اظہارِ اسلام سے خود منع کرتے تھے۔ اور یہ اسلام کے تحفظ کا ایک حکیمانہ طریقِ کار تھا۔ اس ہدایت کے پیشِ نظر بیشتر مسلمان چند سالوں تک اپنے اسلام کو پوشیدہ رکھتے رہے اور کوئی بھی ان کے اسلام سے آگاہ نہ تھا۔ وہ اسی حد تک اسلامی امور کا لحاظ کرتے تھے جہاں تک ان کے حالات اجازت دیتے تھے اور ان کے اختیار میں ہوتا تھا۔ بلکہ جب اسلام ایک جماعتی صورت اختیار کر رہا تھا اور کم کم یہ جماعت آشکارا ہوتی جا رہی تھی اس وقت بھی کچھ مسلمان ایسے تھے جو اپنے ایمان کو مخفی رکھتے تھے اور لوگوں کے اندر غیر مسلم کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے تھے۔ وہ اپنے حالات کی کمزوریوں یا بعض خاندانی مصلحتوں کی بنا پر اپنے ایمان کو مخفی رکھنے پر مجبور تھے۔ اگرچہ وہ کفار کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے اور بظاہر انہی میں شمار ہوتے تھے لیکن وہ اسلامی عقائد کے پورے معتقد تھے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ حضرت عمرؓ کی بہن فاطمہ جو سعید ابن زید سے بیاہی ہوئی تھیں اور اپنے شوہر کے ساتھ اسلام لا چکی تھیں وہ اپنے اسلام کو مخفی رکھتی تھیں۔ اسی طرح نعیم ابن عبداللہ جو قبیلہ بنی عدی سے تھے مسلمان ہو چکے تھے مگر اپنے قبیلہ کے ڈر سے اپنے اسلام کو پوشیدہ رکھتے تھے۔ یونہی اور چند قبیلوں کے افراد اسلام لا چکے تھے مگر قبائلی پابندیوں اور سخت گیریوں کی وجہ سے اپنے

اسلام کو چھپاتے تھے۔ ہجرتِ پیغمبرؐ کے بعد کہ جب مدینہ میں ایک گونہ اسلامی حکومت کی تشکیل ہو چکی تھی۔ مکہ میں مسلمانوں کی ایک ایسی جماعت موجود تھی جو بظاہر مسلمان نہ تھی مگر در پردہ اسلام کی پابند تھی۔ عم رسولِ عباس ابنِ عبدالمطلب بھی اسی جماعت کی ایک فرد تھے۔ چنانچہ ابورافع کہتے ہیں کہ :۔

کنت غلاماً للعباس ابن عبدالمطلب وکان الاسلام قد دخلنا اھل البیت واسلمت ام الفضل واسلمت و کان العباس یھاب قومہ ویکرہ ان یخالفھم وکان یکتم اسلامہ۔ (تاریخ طبری۔ ج ۲۔ ص ۱۵۹)	میں عباس ابنِ عبدالمطلب کا غلام تھا اور پیغمبرؐ کے عزیزوں کے گھروں میں اسلام آ چکا تھا چنانچہ اُم الفضل (زوجہ عباس) اور میں اسلام لا چکے تھے اور عباس اپنی قوم سے ڈرتے تھے اور ان کی مخالفت پسند نہ کرتے تھے اور اپنے اسلام کو چھپائے رکھتے تھے۔"

یہ لوگ اپنے اسلام کو چھپا کر مسلمانوں کی [illegible] ایسی خدمات انجام دیتے جو اظہار اسلام کے بعد ممکن نہ تھیں چنانچہ انہی لوگوں کے ذریعہ قریش کی نقل و حرکت کی خبریں اور دشمن کے جنگی عزائم کی ایسی اطلاعیں مدینہ پہنچتی تھیں جن سے اسلام کا اجتماعی مفاد وابستہ ہوتا تھا اور پیغمبرؐ اکرم پیش آئند حالات میں ان سے فائدہ اٹھاتے تھے اور ہمیشہ ان لوگوں سے رابطہ قائم رکھتے تھے۔ ابن عبدالبر نے عباس ابن عبدالمطلب کے بارے میں تحریر کیا ہے :۔

کان یکتب باخبار المشرکین الی رسول اللہ وکان المسلمون یتقوون بہ بمکۃ وکان یحب ان یقدم علی رسول اللہؐ فکتب الیہ رسول اللہ ان مقامک بمکۃ خیر (استیعاب۔ ج ۲۔ ص ۴۸۵)	وہ مشرکین کے بارے میں تمام خبریں پیغمبرؐ اکرم کو تحریراً بھیجتے جس سے مسلمانوں کو تقویت حاصل ہوتی عباس چاہتے تھے کہ رسول اللہ کے پاس چلے جائیں۔ مگر آنحضرتؐ نے انہیں تحریر کیا کہ تمہارا مکہ ہی میں قیام بہتر و سود مند ہے۔"

اس سے معلوم ہوا کہ ان لوگوں کا اخفائے اسلام پیغمبرؐ کی اجازت سے تھا۔ اور اگر اخفائے اسلام آئینِ اسلام کے خلاف ہوتا تو آنحضرتؐ اس کی اجازت نہ دیتے۔ بہرحال اخفائے اسلام، اسلام کے منافی نہیں ہے اور مخفی اسلام بھی دینِ پیغمبرؐ میں اسی طرح موردِ اعتبار و اعتماد ہے جس طرح علانیہ اقرارِ اسلام۔

اگر اثباتِ ایمان کے لئے زبانی اقرار و اعلان کو بھی ضروری قرار دیا جائے تو یہ شرط تو بہرحال غیر ضروری ہو گی کہ وہ مخصوص لفظوں میں ہو تو معتبر ہے ورنہ ناقابلِ اعتبار۔ جب یہ قید ضروری نہیں ہے تو ابوطالب کے اقرار رسالت سے انکار نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ انہوں نے مختلف الفاظ و عبارت میں آنحضرتؐ کی نبوت کا اعتراف کیا ہے۔ چنانچہ پیغمبرؐ اکرم ایک مرتبہ اُن کے ہاں عیادت کے لئے آئے تو آپ نے عرض کیا :۔

یا بن اخی ادع ربك الذی بعثك یعافینی۔ (اصابہ۔ ج ۴۔ ص ۱۱۶)

اے میرے بھتیجے اپنے پروردگار سے دعا کیجیے جس نے آپ کو مبعوث کیا ہے کہ مجھے شفا بخشے۔"

آنحضرتؐ نے دست بدعا ہو کر کہا اللھم اشف عمی۔ "خدایا میرے چچا کو شفا دے" اس دعا کے نتیجہ میں آپ فوراً شفایاب ہو گئے اور بستر بیماری سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اگر آپ آنحضرتؐ کو خدا کا فرستادہ رسولؐ نہ سمجھتے ہوتے تو ان کی رسالت و بعثت کو بیچ میں لا کر دعا کے طلبگار نہ ہوتے۔ کیا بعثت کا اعتراف رسالت کا اعتراف نہیں ہے اور کیا دعا کے نتیجہ میں فوراً شفایابی سے ان کے یقین پر جلا نہ ہوئی ہوگی؟ اس کے علاوہ آپ کے وہ اشعار اقرار رسالت کے ثبوت میں بہت کافی ہیں جن میں اسلام کی صداقت دین کی حقانیت اور آنحضرتؐ کی رسالت کا واضح لفظوں میں اعتراف کیا گیا ہے اور وہ اشعار اس کثرت سے ہیں کہ ابن شہر آشوب مازندرانی کے متشابہات القرآن میں سورۂ حج کی آیت ولینصرنہ اللہ من ینصرہ کے ذیل میں تحریر کیا ہے کہ حضرت ابوطالب کے وہ اشعار جو ان کے ایمان و تصدیق رسالت پر روشنی ڈالتے ہیں۔ تین ہزار سے زائد ہیں۔ ابن ابی الحدید نے آپ کے مختلف اشعار درج کرنے کے بعد تحریر کیا ہے:۔

ھٰذہ الاشعار جاءت مجیٔ التواتر لانہ ان لم یکن احادھا متواترہ فمجموعھا یدل علی امر واحد مشترك وھو تصدیق محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ومجموعھا متواتر۔ (شرح ابن ابی الحدید۔ ج ۳۔ ص ۳۱۵)

یہ اشعار تواتر کے طور پر نقل ہوتے آئے ہیں اگر متفرق طور پر ان میں تواتر نہ بھی ہو مگر مجموعی طور پر بہرحال متواتر ہیں کیونکہ وہ مجموعی طور پر ایک ہی امر کی نشاندہی کرتے ہیں جو ان سب میں قدرِ مشترک ہے۔ اور وہ قدرِ مشترک محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صداقت کا اعتراف ہے۔"

ذیل میں حضرت ابوطالب کے چند اشعار درج کئے جاتے ہیں۔ یہ اشعار ان کے عقائد و نظریات کی پوری ترجمانی کرتے ہیں اور مؤرخین نے انہیں صحت و وثوق کے ساتھ نقل کیا ہے۔

جب کفار قریش نے پیغمبرؐ کی طرف کذب بیانی کی نسبت دی تو آپ نے آنحضرتؐ کو مخاطب کر کے یہ اشعار کہے:۔

انت الامین امین اللہ لا کذب　　والصادق القول لا لھو ولا لعب

آپؐ امین اور اللہ کے امین ہیں جس میں جھوٹ نہیں۔ اور لچر اور پوچ باتوں سے پاک اور راست گفتار ہیں۔"

انت الرسول رسول اللہ تعلمہ　　علیك تنزل من ذی العزۃ الکتب

آپ وہی اللہ کے رسول ہیں جن کا ہمیں علم ہے۔ اور آپ ہی پر تو رب العزت کی طرف سے قرآن نازل ہوا۔" (مناقب شہر آشوب ۔ ج ۱۔ ص ۳۹)

جب قریش نے آپ سے یہ کہا کہ پیغمبرؐ کو خاموش کیجئے۔ ورنہ ہم سختی و تشدد کریں گے، تو آپ نے یہ اشعار کہے: ؎

واللہ لن یصلوا الیك بجمعھم حتیٰ اوسد فی التراب دفینا

خدا کی قسم جب تک میں زیرِ زمین دفن نہ کر دیا جاؤں قریش اپنے جتھوں سمیت آپؐ کے قریب پھٹک نہیں سکتے۔"

فاصدع بامرك ماعلیك غضاضۃ وابشر بذاك وقر منك عیونا

بے کھٹکے اللہ کے احکام بیان کیجیے اور اس طرح خوش و خرم رہ کر اپنی آنکھوں کو ٹھنڈا کیجیے۔"

ودعوتنی وعلمت انك ناصحی ولقد دعوت وکنت ثم امینا

آپ نے مجھے دعوتِ اسلام دی اور میں سمجھتا ہوں کہ آپ میرے خیر خواہ ہیں اور پھر آپ امین بھی تو ہیں۔"

ولقد علمت بان دین محمدؐ من خیر ادیان البریۃ دینا

مجھے یقین ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا دین دنیا کے تمام دینوں سے بہتر ہے۔" (تاریخ ابن کثیر ج ۳ ص ۴۲)

جب شعب ابوطالب میں پناہ لی تو ایک سو بیس اشعار کا ایک طویل قصیدہ کہا۔ اس قصیدہ کے چند شعر یہ ہیں: ؎

کذبتم وبیت اللہ نبزی محمدًا ولما نطاعن دونہ ونناضل

خانہ کعبہ کی قسم تمہارا خیال غلط ہے کہ ہم محمدؐ کے بارے میں دبا دیئے جائیں گے اور ان کے سینہ سپر ہو کر نیزے اور تیر نہیں چلائیں گے۔"

ونسلمہ حتیٰ نصرع حولہ ونذھل عن ابنائنا والحلائل

ہم اس وقت تک انہیں دشمنوں کے حوالے نہیں کریں گے جب تک اُن کے سامنے مر نہ جائیں اور اپنے بیوی بچوں کو بھول نہ جائیں۔"

حدبت بنفسی دونہ وحمیتہ ودافعت عن بالزراء والکلاکل

میں نے دل و جان سے اُن کی حفاظت کی اور اپنے دست و بازو اور سینہ کے زور سے اُن کا دفاع کیا۔"

فایدہ رب العباد بنصرہ واظھر دینا حقہ غیر باطل

پروردگارِ عالم اپنی نصرت سے اُن کی دستگیری کرے اور اس دین کو جو سراسر حق، اور باطل کی

آمیزش سے پاک ہے غلبہ دے۔" (سیرۃ ابن ہشام۔ ج ۱ ص ۱۲۹)

ابن ہشام نے اس قصیدہ کے متعدد اشعار درج کرنے کے بعد تحریر کیا ہے۔ کہ ایک سال اہل مدینہ بارش کے نہ ہونے سے قحط کی سختیوں میں مبتلا ہو گئے پریشان و سراسیمہ حال پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور التجا کی کہ آپ دُعا فرمائیں کہ اللہ بارش برسائے اور قحط سالی دور کرے۔ پیغمبر اکرمؐ نے ہاتھ اُٹھا کر دعا مانگی ابھی دُعا کے الفاظ ختم ہوئے تھے کہ افق پر گھٹائیں چھا گئیں اور اس طرح جھوم کر برسیں کہ جل تھل بھر گئے۔ برستے پانی کو دیکھ کر آنحضرت کو ابوطالب یاد آئے اور فرمایا: لو ادرك ابوطالب هذا اليوم لسره "اگر آج ابوطالب زندہ ہوتے تو بہت خوش ہوتے" ایک شخص نے کہا شائد آپ کو ان کا یہ شعر یاد آگیا ہے جو آپ کے بارے میں کہا تھا: ؎

وابيض يستسقى الغمام بوجهه ثمال اليتمى عصمة للارامل

وہ روشن چہرے والے جن کے روئے مبارک کا واسطہ دے کر باران رحمت طلب کی جاتی ہے جو یتیموں کی ڈھارس اور بیواؤں کا سہارا ہیں"

فرمایا کہ ہاں میرا اشارہ اسی طرف تھا۔

پیغمبرؐ کے دل پر ابوطالب کی محبت و خلوص کے نقوش اتنے گہرے نقش تھے کہ وہ کسی لمحہ انہیں فراموش نہ کرتے تھے اور زندگی کے آخری لمحوں میں بھی ان کی یاد تازہ کی۔ بلاذری نے لکھا ہے کہ جب آنحضرت پر مرض کی شدت ہوئی۔ اور جناب فاطمہ نے آپ کی حالت دگرگوں دیکھی تو کہا آپ پر فدا، خدا کی قسم آپ ویسے ہی ہیں جیسا کہ کہنے والے نے کہا ہے: ؎

وابيض يستسقى الغمام بوجهه ثمال اليتمى عصمة للارامل

آنحضرتؐ نے یہ سن کر آنکھیں کھول دیں اور فرمایا:۔

هذا قول عمى ابى طالب (انساب الاشراف ج ۱ ص ۵۵۳) "یہ تو میرے چچا ابوطالب کا شعر ہے۔"

ابوطالب کے اشعار اُن کے جذبۂ ایمان، جوشِ عقیدت، اعترافِ صداقت اور اسلام و بانیٔ اسلام سے والہانہ محبت کے آئینہ دار ہیں۔ اور ایک ایک شعر ان کے ایمان کی ناطق برہان اور روشن آیت ہے۔ اگر تعصب و تنگ نظری سے کام نہ لیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ ان کے ایمان سے انکار کیا جائے یا اس میں شک و شبہ کیا جا سکے۔ انصاف سے کہئے کہ اگر ان اشعار میں سے ایک آدھ شعر کسی اور کی طرف منسوب ہوتا تو کیا اسے اس کے ایمان کی دستاویز بنا کر پیش نہ کیا جاتا اور ایک ناقابلِ شکست دلیل کا درجہ نہ دیا جاتا۔ پھر کس گناہ کی پاداش میں ابوطالب ایسے جاں نثارِ پیغمبرؐ کے ایمان سے صریح انکار کیا جاتا ہے۔ کیا اس جرم پر کہ انہوں نے آنحضرتؐ کو پالا پوسا اور پروان چڑھایا، یا اس جرم پر کہ انہوں نے کفار قریش سے ان کا تحفظ کیا۔ یا اس قصور پر کہ انہوں نے مشرکین

کی سازشوں کو ناکام بنایا یا اس خطا پر کہ انہوں نے جان، مال اور اولاد کی قربانی تک سے دریغ نہ کیا یا اس جرم پر کہ انہوں نے اپنے اشعار کے ذریعہ نبوت کا پیغام عرب کے گوشہ گوشہ میں پہنچایا۔ اگر کفر اس کا نام ہے تو ملأ اعلیٰ سے روحِ ابوطالب پکارے گی کہ:
"نازم بہ کفر خود کہ بہ ایمان برابر است۔"

حقیقت یہ ہے کہ ابوطالب کا جرم ایک اور صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ وہ حضرت علیؑ کے والد ہیں ورنہ ہر چشمِ بینا تاریکی و روشنی کا فرق محسوس کرتی اور کفر و ایمان میں امتیاز کر سکتی ہے۔ اگر روشنی کی شعاعیں نظروں کو کھینچ رہی ہوں اور کسی تاریک نظر انسان کو ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آئے اور روشنی کی کرن تک دکھائی نہ دے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ نور و روشنی کا وجود نہیں ہے۔ وہ تو اپنے مقام پر ایک حقیقت ثابتہ ہے۔ اسی طرح ابوطالب کا ایمان بھی ایک تابندہ حقیقت ہے جس سے وہی انکار کرے گا جو سپیدۂ سحر اور ضیائے انجم کے انکار کا عادی ہو۔ ابن ابی الحدید نے کیا خوب کہا ہے:

وما ضر مجد ابی طالب جھول لغا او بصیر تعامی

کسی جاہل کی بیہودہ گوئی اور واقفِ حال کی عمداً چشم پوشی سے ابوطالب کی عظمت و بزرگی گھٹ نہیں سکتی۔"

کما لا یضر ایاۃ الصباح من ظن ضوء النہار الظلاما

جس طرح دن کے اجالے کو اندھیرا سمجھ لینے سے صبح کی درخشندگیوں پر برا اثر نہیں پڑتا۔"

حضرت ابوطالب کے ایمان کا اثبات انہی شعروں پر منحصر نہیں ہے بلکہ اشعار سے بڑھ کر اہمیت ان اقوال وارشادات کی ہے جو پیغمبر اکرمؐ اور ائمہ اہلبیتؑ نے ان کے ایمان کے سلسلہ میں فرمائے ہیں۔ یہ ارشادات دو اعتبار سے اہمیت رکھتے ہیں۔ ایک یہ کہ ائمہ اہلبیتؑ انہی کی اولاد اور انہی کے خاندان کے افراد ہیں اور ہر شخص کی زندگی کا ورق اس کی اولاد اور خاندان کے سامنے کھلا ہوتا ہے وہ ان سے نہ اپنا عقیدہ مخفی رکھ سکتا ہے اور نہ اپنے اعمال وافعال۔ اس لئے ان کی شہادت زیادہ اعتماد و اعتبار کے قابل ہوگی۔ دوسرے یہ کہ شرعی نقطۂ نظر سے بھی ان کے اقوال وارشادات سند قرار دیئے گئے ہیں جس کے بعد نہ انہیں جنبہ داری پر محمول کیا جاسکتا ہے نہ خاندانی عصبیت پر۔ چنانچہ محدث دہلوی نے حدیث نبویؐ ما ان اخذتم بہ لن تضلوا کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے:

المراد بالاخذ لھم التمسک بمحبتھم ومحافظۃ حرمتھم والعمل بروایتھم والاعتماد علیٰ مقالتھم۔ (حاشیۂ مشکوٰۃ۔ صد ۵۶۹)

اخذ سے مراد یہ ہے کہ اہلبیتؑ کی محبت سے وابستہ رہا جائے، ان کی عزت و حرمت کا پاس ولحاظ رکھا جائے۔ ان کی روایات پر عمل کیا جائے اور ان کے اقوال پر اعتماد کیا جائے۔"

آئمہ اہل بیت میں سے کسی ایک نے بھی ابوطالب کے ایمان میں شک و شبہ کا اظہار نہیں کیا۔ بلکہ سب کے سب ان کے ایمان پر متفق و متحد ہیں۔ اس اتفاق و اتحاد کو اجماع اہلبیتؑ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور یہ اجماع علماء اسلام کے نزدیک ایک مستند ماخذ تسلیم کیا جاتا ہے اور حجت و سند کا درجہ رکھتا ہے۔ چنانچہ ابوالکرام عبدالسلام ابن محمد کہتے ہیں :۔

اتفق ائمۃ اھل البیت ان اباطالب مات مسلمًا و خلاف اھل البیت فی الاسلام غیر معتبر (ارجح المطالب ۔ صـ ۲۹۸)	ائمہ اہل بیتؑ اس امر پر متفق ہیں کہ ابوطالب مسلمان مرے۔ اور جو بات اہلِ بیتؑ کے مسلک کے خلاف ہو وہ اسلام میں غیر معتبر ہے ۔"

علمائے شیعہ میں سے علامہ طبرسی تحریر کرتے ہیں :۔

قد ثبت اجماع اھل البیتؑ علی ایمان ابی طالب و اجماعھم حجۃ ۔ (مجمع البیان ۔ ج ۲ ۔ صـ ۲۸۷)	ابوطالب کے ایمان پر اہل بیت کا اجماع ثابت ہے اور ان کا اجماع حجت و سند ہے ۔"

ذیل میں پیغمبرؐ اسلام اور آئمہ اہلبیتؑ کے متعدد ارشادات میں سے چند ارشاد درج کیے جاتے ہیں جو اس امر کا واضح ثبوت ہیں کہ آنحضرتؐ اور اہلبیتؑ اطہار ابوطالب کے ایمان اور ان کی نجات اخروی پر یک رائے و یک زبان تھے۔

عباس ابن عبدالمطلب نے پیغمبر اکرمؐ سے عرض کیا کہ کیا آپ ابوطالب کی نجات کے متوقع ہیں ؟ فرمایا :۔

کل الخیر ارجو من ربی (طبقات ابن سعد ۔ ج ۱ ۔ صـ ۱۲۴)	میں اُن کے لئے اپنے پروردگار سے ہر قسم کی بھلائی کا متوقع ہوں ۔"

حضرت علی ابن ابی طالبؑ کا ارشاد ہے :۔

ما مات ابوطالب حتی اعطی رسولؐ اللہ من نفسہ الرضا ۔ (شرح ابن ابی الحدید ۔ ج ۳ ۔ صـ ۳۱۲)	ابوطالب اس وقت تک موت سے ہمکنار نہیں ہوئے جب تک رسولؐ خدا کو اپنی طرف سے راضی و خوشنود نہیں کر لیا ۔"

امام زین العابدین علیہ السلام سے ایمانِ ابوطالب کے بارے میں پوچھا گیا تو آپؑ نے فرمایا :۔

وا عجبا ان اللہ نھی رسولہ ان	تعجب ہے کہ اللہ نے تو رسولؐ خدا کو یہ حکم دیا کہ وہ

یقر مسلمۃ علیٰ نکاح کافر و قد کانت فاطمۃ بنت اسد من السابقات الی الاسلام ولم تزل تحت ابی طالب حتیٰ مات۔
(شرح ابن ابی الحدید۔ ج ۳۔ ص۳۱۲)

کسی مسلمان عورت کو کافر کے نکاح میں نہ رہنے دیں، اور فاطمہ بنت اسد جو اسلام میں سبقت کرنیوالی خواتین میں سے تھیں وہ ابوطالب کے مرتے دم تک ان کی زوجیت میں رہیں۔"

اس مقام پر یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ فاطمہ بنتِ اسد اوائل بعثت میں اسلام لائیں اور بعد اسلام دس برس تک حضرت ابوطالب کی زوجیت میں رہیں۔ اگر ان دونوں میں مذہبی اختلاف ہوتا تو اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ دونوں میں آئے دن تکرار اور مذہبی تنازع رہتی۔ مگر کوئی تاریخ یہ نہیں بتاتی کہ اُن میں کبھی لڑائی جھگڑا یا نظریاتی ٹکراؤ پیدا ہُوا ہو۔

امام محمد باقر علیہ السلام کا ارشاد ہے:۔

مات ابوطالب ابن عبد المطلب مسلما مومنا۔ (الحجۃ: ابن معد ص۲۷)

ابوطالب ابن عبدالمطلب دنیا سے مسلم و مومن اُٹھے۔"

امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک شخص نے کہا کہ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ابوطالب کافر مرے؟ فرمایا وُہ لوگ جھوٹے ہیں۔ وہ تو پیغمبرؐ کی نبوت کا اعتراف و اقرار کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

الم تعلموا انا وجدنا محمدًا نبیا کموسیٰ خط فی اول الکتب

"کیا تمہیں نہیں معلوم کہ ہم نے محمدؐ کو ویسا ہی پایا ہے جیسے موسیٰؑ تھے جن کا تذکرہ پہلی کتابوں میں موجود ہے۔" (اصول کافی۔ ص۲۴۴)

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے درست ابن ابی منصور نے ایمان ابوطالب کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا:۔

اقر بالنبی وبما جاء بہ۔
(اصول کافی۔ ص۲۴۴)

انہوں نے پیغمبرؐ کا اور جن چیزوں کو وُہ لے کر آئے سب کا اقرار کیا۔"

امام رضا علیہ السلام نے ابان ابن محمود کو اس کے ایک مکتوب کے جواب میں تحریر فرمایا:۔

ان لم تقر بایمان ابی طالب کان مصیرك الی النار۔
(مرآۃ العقول۔ ج ۲۔ ص۲۶۴)

اگر تم ابوطالب کے ایمان کا اقرار نہیں کروگے تو تمہاری بازگشت دوزخ کی طرف ہوگی۔"

امام حسن عسکری علیہ السلام کا ارشاد ہے :۔

ان اباطالب کمومن آل فرعون یکتم ایمانہ (الحجۃ ابن معد ص۱۱۵)

"ابو طالب مومن آل فرعون کی مانند تھے جو اپنے ایمان کو مخفی رکھتے تھے"

ابتدائے زمانہ بعثت میں ابو طالب کا اپنے ایمان کو پردۂ خفا میں رکھنا اور کفار قریش کے سامنے کھل کر اپنے عقیدہ کا اظہار نہ کرنا ان کی انتہائی فراست و موقع شناسی کا نتیجہ تھا۔ اگر وہ اعلانِ رسالت کے ساتھ ہی اسلام کا اعلان کر دیتے تو کفار قریش نے جس طرح آنحضرتؐ کے خلاف علانیہ محاذ قائم کر لیا تھا اسی طرح ان کی دشمنی پر بھی کھلم کھلا اتر آتے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ جس طوفانِ مخالفت کو وہ اپنے تدبر اور حکمت عملی سے روکے ہوئے تھے نہ روک سکتے، بلکہ قریش کو اپنا حریف بنا کر اس نہج پر پیغمبرؐ کی مدد نہ کر سکتے جس نہج پر انہوں نے کی ہے۔ اگرچہ کفار قریش سے یہ بات ڈھکی چھپی ہوئی نہ تھی کہ ابو طالب ہر موقع پر پیغمبرؐ کا ساتھ دیتے اور اُن کی تائید و حمایت کرتے ہیں جس کی وجہ سے اسلام کی آواز اُبھر رہی ہے اور مسلمانوں کا دائرہ وسیع ہو رہا ہے۔ مگر ان کے پاس بظاہر کوئی وجہ جواز نہ تھی کہ وہ اُن سے الجھتے اور انہیں اپنا حریف ٹھہراتے۔ اس مدبرانہ روش کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں کفار کو سمجھانے بجھانے اور اسلام کی خوبیوں سے آگاہ کرنے کے مواقع ملتے جس سے حق پسند افراد اسلام کی طرف کھنچتے اور پیغمبرؐ کے ہدایت آفرین کلمات کان دھر کر سنتے۔ اگر ابو طالب یہ طریق کار اختیار نہ کرتے تو اس کفر پرور فضا میں جب کہ قریش اپنی کثرت اور طاقت کے بل بوتے پر حق کو دبانے اور اسلام کو کچلنے پر تلے ہوئے تھے کبھی اسلام کو ابھرنے کا موقع نہ ملتا۔ بلاشبہ قریش کی معاندانہ کارروائیوں اور مخالفت کی طوفان انگیزیوں میں آنحضرتؐ کو تبلیغ اسلام کا جو بھی موقع ملا وہ ابو طالب کی حمایت و طرفداری اور ان کے مدبرانہ طریق کار اور حکیمانہ روش کی بدولت ملا۔ اگر ان کا دم نہ ہوتا تو ظاہری اسباب و حالات کی بناء پر اسلام کا آوازہ فضائے مکہ میں بلند نہ ہوتا، اور حق کی آواز باطل کے شور و شغب میں دب کر رہ جاتی۔ یہ انہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ اسلام کا چراغ کفر کی تیز آندھیوں کے تھپیڑوں سے محفوظ رہا اور کفار و مشرکین کی سینہ زوریوں کے باوجود اس کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی گئی۔ فرقہ معتزلہ کے مشہور عالم ابن ابی الحدید نے ایمانِ ابو طالب میں سکوت اختیار کرنے کے باوجود ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے کہا ہے :۔

ولولا ابو طالب وابنہ لما مثل الدین شخصا وقاما

"اگر ابو طالب اور ان کے فرزند (علیؑ) نہ ہوتے تو اسلام کبھی اپنے پیروں پر جم کر کھڑا نہ ہوتا۔"

فذاک بمکۃ آوی وحامی وھذا بیثرب خاض الحماما

ان میں سے ایک نے مکہ میں حمایت و پشت پناہی کی اور دوسرے نے مدینہ میں اپنی جان کو

خطروں میں ڈالا۔"

فللّٰہ ذا فاتحا للھدیٰ   وللّٰہ ذا للمعالی ختاما

کیا کہنا اس کا جس نے ہدایت کو فتح یاب کیا، اور کیا کہنا اس کا جس پر بزرگیوں کا خاتمہ ہوا۔"

یہ امر انتہائی تعجب انگیز ہے کہ ایک طرف تو یہ اعتراف کیا جاتا ہے کہ حضرت ابوطالب کی جانبازیوں اور عملی کوششوں کے نتیجہ میں اسلام کی آواز بلند ہوئی اور انہوں نے پورے ثبات و استقلال کے ساتھ اپنی زندگی کا طویل عرصہ آنحضرتؐ کی نصرت و حمایت میں صرف کیا اور دوسری طرف اُن کے کفر پر بھی زور دیا جاتا ہے۔ اور اُن کی تمام خدمات کو بے اثر بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اور یہ کوششیں ان لوگوں کی طرف سے ہوتی ہیں جو کمزور سے کمزور قرائن و شواہد کو اثباتِ ایمان کے لئے کافی سمجھتے ہیں اور بعض افراد کے ایمان میں باوجودیکہ وہ نبوت میں شک کرتے رہے، شبہ تک نہیں کرتے، مگر یہاں ذہنی و فکری رجحان دوسرا راستہ اختیار کرتا ہے اور اس جانباز و جاں نثارِ اسلام کو اس کی محنتوں، کاوشوں اور دینی خدمتوں کے باوجود دائرۂ اسلام سے خارج قرار دیا جاتا ہے حالانکہ ان کے کلام پر نظر کی جائے تو اس میں توحید و رسالت کے اعتراف کے جواہر ریزے جگمگاتے نظر آتے ہیں۔ اور اس اقرار و اعتراف کے ساتھ اُن کے افعال و اعمال وہ ہیں کہ کسی ایک عمل کو بھی اسلام کے خلاف ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ کیا ایمان کے اجزاء اعتقاد بالجنان، تصدیق باللسان اور عمل بالارکان میں کوئی جزو ایسا ہے، جو ان میں نظر نہ آتا ہو؟ ابوطالب کا اخفا بھی اظہار اور خاموشی میں گویائی تھی۔ اس لئے کہ ان کی عملی زندگی سراپا اسلام کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی۔ اور ان کا ایک ایک عمل تصدیق نبوت کا آئینہ دار اور صداقتِ اسلام کے اعتراف کا زندہ ثبوت ہے انہوں نے قولاً و عملاً اس طرح پیغمبرؐ اسلام کی نصرت و حمایت کی کہ جو نظریات اسلام کے خلاف رہ کر ممکن ہی نہ تھی اور نہ اُبھرے ہوئے فتنوں کو دبانا، قریش کی سازشوں کو کچلنا اور پیغمبرؐ کے سینہ سپر رہ کر اسلام کے پھلنے پھولنے کی راہیں ہموار کرنا، کفر و شرک کے عقیدہ سے میل کھاتا ہے۔ کیا ان کی تکفیر سے پیغمبرؐ اور اہلبیت اطہار کی تکذیب لازم نہ آئے گی اور کیا پیغمبرؐ کو یہ امر ناگوار نہ ہوگا کہ ایک مسلمان کو کافر گردانا جائے۔ اور اُن کے ناصر و دوست پر دشمنی کا شبہ کیا جائے۔

اگر ان تمام شواہد و براہین کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تو اس سے تو کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ ابوطالب پیغمبر اکرمؐ سے شیفتگی کی حد تک محبت رکھتے تھے اور عشق رسول اُن کے رگ و پے میں خون کے ساتھ ساتھ گردش کرتا تھا۔ یہ محبت و وارفتگی خود ان کے اسلام کا ایک بیّن ثبوت ہے۔ اس لئے کہ محبتِ رسول اور بغضِ اسلام یکجا نہیں ہو سکتے جس طرح بغض رسولؐ اور اسلام دوستی یکجا نہیں ہو سکتی۔ اگر دل میں محبت رسولؐ رچی بسی ہو اسلام بھی ہے۔ اور اگر دل جذب و عشقِ رسولؐ سے خالی ہو تو اسلام کا دعویٰ ہو بھی تو وہ صرف ایک دعویٰ ہی ہوگا جس

یں صداقت نہ ہو اور ایک کالبد ہو گا جس میں زندگی و حیات نہ ہو۔ کیونکہ عشقِ رسولؐ ہی اصلِ اسلام، روحِ اسلام بلکہ عینِ اسلام ہے ؎

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی　　نہ ہو تو مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق

ایک طبقہ اگرچہ ذہنی طور پر اُن کے کفر کو تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہے۔ مگر چند بے سر و پا روایتوں کی بنا پر کھل کر اُن کے اسلام کا اعتراف بھی نہیں کرتا۔ حالانکہ یہ روایتیں صحت کے معیار پر پوری نہیں اترتیں اور اُن پہ وضعیت کے آثار اتنے نمایاں ہیں کہ ان کے موضوع و خود ساختہ ہونے میں شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ ان روایات کے کھوکھلا پن کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کچھ دسیسہ کاروں اور اموی ہوا خواہوں نے محسنِ اسلام و مربّیِ پیغمبرؐ کی خدمات پر پردہ ڈالنے اور اُن کے فرزند حضرت علیؑ کے پدری امتیاز کو ختم کرنے کے لئے ایسی روایتیں وضع کر لیں جن سے ان کے کفر کا اثبات ہو اور اس طرح حضرت علیؑ کو بھی اس صف میں کھینچ لائیں جس میں دوسرے نظر آتے ہیں ضرورت ہے کہ ان روایتوں پر ایک نظر کی جائے تاکہ نقد و تجزیہ کی روشنی میں اربابِ بصیرت خود فیصلہ کر سکیں کہ یہ اصولِ صحت کے معیار پر پوری اترتی ہیں یا وضعی و خود ساختہ ہیں اور کہاں تک ان سے استناد و احتجاج کیا جا سکتا ہے۔

پہلی روایت یہ ہے کہ جب ابوطالب کا وقتِ آخر آیا تو پیغمبرِ اکرمؐ ان کے ہاں تشریف لے گئے۔ وہاں پر ابوجہل اور عبداللہ ابن اُمیہ بھی موجود تھا۔ آنحضرتؐ نے فرمایا چچا لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰہُ پڑھئے تاکہ میں آپ کے ایمان کی شہادت دے سکوں۔ ابوجہل اور عبداللہ ابن اُمیہ نے ابوطالب سے کہا کیا آپ ملّتِ عبدالمطلب سے رُوگرداں ہو جائیں گے۔ ابوطالب نے کہا:- اَنَا عَلٰی مِلَّۃِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ۔ میں عبدالمطلب کی ملت ہی پر ہوں اور کلمہ نہ پڑھا اس پر آنحضرتؐ نے فرمایا لاستغفرن لك مالم انه عنه۔ اگر مجھے منع نہ کیا گیا تو میں آپ کے لئے دعائے مغفرت کرتا رہوں گا۔ جس پر یہ آیت نازل ہوئی:-

ما کان للنبی والذین اٰمنوا ان یستغفروا للمشرکین ولو کانوا اولی قربی من بعد ما تبین لھم انھم اصحاب الجحیم۔	نبی اور اہلِ ایمان کو چاہیئے کہ وہ مشرکوں کے لئے دعائے مغفرت نہ کریں اگرچہ وہ اُن کے قرابت دار کیوں نہ ہوں جب کہ اُن پر یہ امر واضح ہو چکا ہے کہ وہ دوزخی ہیں۔

یہ روایت متعدد وجوہ سے محلِ نظر ہے۔

اوّلاً یہ کہ اس کا راوی مسیب ہے۔ ابن حجر عسقلانی نے تہذیب التہذیب میں تحریر کیا ہے کہ مسیب ان رواۃ میں سے ہے جو ابوسفیان ابن حرب اور اپنے باپ حزن سے روایت کرتا ہے اور اس سے صرف اس کا

بیٹا سعید روایت کرتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس دور میں نہ اس کی روایت کو اہمیت دی جاتی تھی اور نہ اس پر اعتماد و وثوق کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ یہ فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہوا۔ اور حضرت ابوطالب کی وفات کے وقت نہ تو یہ مسلمان تھا اور نہ اس موقع پر اس کے موجود ہونے کے قرائن ہیں اور نہ کسی نے اس کی موجودگی کا دعوے کیا ہے۔ اگر اس نے یہ واقعہ کسی سے سنا تھا تو جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ کس سے سنا تھا نہ اس روایت کا کوئی وزن ہو سکتا ہے اور نہ اس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے جب کہ یہ واقعہ اس کے زمانہ کفر کا ہے۔ اور پھر مسیب سے اس کے بیٹے سعید نے روایت کی ہے جو حضرت عمر کے زمانہ خلافت میں پیدا ہوا اور ان لوگوں میں شمار ہوتا تھا جو حضرت علیؑ اور اہلبیت اطہارؑ سے منحرف سمجھے جاتے تھے۔ چنانچہ ابن ابی الحدید نے تحریر کیا ہے:۔

كان سعيد ابن المسيب منحرفا عنه۔ (شرح نہج۔ ج ۱۔ ص۳۷۰)	سعید ابن مسیب حضرت علیؑ سے منحرف و برگشتہ تھا۔"

اس کی اہلبیت دشمنی کا یہ واقعہ شاہد ہے کہ جب امام زین العابدین علیہ السلام نے رحلت فرمائی اور ان کا جنازہ مسجد نبوی میں لایا گیا تو تمام لوگ نماز جنازہ میں شریک ہوئے مگر یہ مسجد میں بیٹھا رہا اور نماز میں شریک نہ ہوا۔ اس سے کہا گیا کہ کیا تم اس مرد صالح کی نماز میں شریک نہ ہو گے؟ اس نے جواب دیا:۔

اصلی رکعتین فی المسجد احب الی من ان اشهد هذا الرجل الصالح فی البیت الصالح۔ (طبقات ابن سعد۔ ج۵۔ ص۲۲۲)	میں اس متبرک جگہ میں ایک مرد صالح کی نماز جنازہ پڑھنے سے دو رکعت نماز پڑھ لینا زیادہ پسند کرتا ہوں۔"

اس دشمنی و کج ذہنی کی کوئی حد ہے کہ اہلبیت کی ایک جلیل القدر ہستی پر نماز جنازہ بھی گوارا نہیں کی جاتی کیا ایسے شخص کی روایت پر کسی کے مومن و غیر مومن ہونے کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ خصوصاً حضرت ابوطالب کے ایمان کے بارے میں اس کی روایت کا کوئی وزن ہو سکتا ہے جب کہ اولاد ابوطالب کے ساتھ اس کا بغض و عناد اس حد تک ہو۔

دوسرے یہ کہ یہ روایت اس روایت سے متعارض ہے جس میں اس امر کی صراحت ہے کہ حضرت ابوطالب نے زندگی کے آخری لمحوں میں اپنے لبوں کو جنبش دی اور کلمۂ توحید پڑھا۔ یہ روایت متعدد علماء و مورخین نے اپنی کتابوں میں درج کی ہے۔ چنانچہ مورخ ابوالفدا تحریر کرتے ہیں:۔

لما تقارب من ابی طالب الموت جعل یحرك شفتیه فاصغى الیه العباس وقال واللہ یا ابن اخی	جب ابوطالب کا وقت وفات قریب آیا تو انہوں نے اپنے ہونٹوں کو جنبش دی۔ عباس نے کان لگا کر سنا تو آنحضرتؐ سے کہا اے برادر زادے خدا کی

قال الکلمۃ التی امرتہ ان یقولھا فقال رسول اللہ الحمد للہ الذی ھداک یا عم۔ (تاریخ ابو الفداء۔ ج ۱۔ ص ۱۲۰)

قسم! ابوطالب نے وہ کلمہ پڑھا ہے جو آپ ان سے پڑھوانا چاہتے تھے۔ آنحضرتؐ نے سنا تو فرمایا اے چچا اللہ کا شکر ہے کہ اس نے آپ کو ہدایت کی۔"

اس روایت کو صرف سابقہ روایت سے تعارض دکھانے کے لئے تحریر کیا گیا ہے۔ ورنہ جو ابتدائے بعثت سے آنحضرتؐ کو صادق اور امین اور خدا کا فرستادہ رسولؐ سمجھتا رہا ہو ان کی سچائی اور راست بیانی کا معترف ہو۔ اور اپنی زندگی کا نصب العین ہی پیغمبرؐ کی نصرت و حمایت اور ترویج و تبلیغ اسلام قرار دے چکا ہو اور جس کے قول و عمل کا محور صرف احیائے اسلام اور اعلائے کلمۃ الحق ہو اس سے اقرار لینے اور کلمہ پڑھوانے کے معنی ہی کیا ہوتے ہیں۔ اور اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ آنحضرتؐ نے ان سے کلمہ پڑھنے کے لئے کہا تو یہ ایسا ہی تھا جیسے ہر مومن کو آخر وقت کلمہ پڑھنے کی تلقین کی جاتی ہے۔ اور وہ کلمہ پڑھتا ہے۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اب اس سے توحید و رسالت کا اقرار لے کر اسے مسلمان کیا جا رہا ہے۔

تیسرے یہ کہ اس روایت سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ آیت مذکورہ حضرت ابوطالب کے انتقال کے فوراً بعد نازل ہوئی ہوگی تاکہ پیغمبرؐ کو ایک فعل نامشروع سے روک دیا جائے۔ حالانکہ یہ آیت سورۃ برأۃ کی ہے اور سورۂ برأۃ بالاتفاق فتح مکہ کے بعد نازل ہوا۔ اور حضرت ابوطالب ہجرت سے تین سال قبل وفات پا چکے تھے یعنی اس سورۃ کے نازل ہونے سے تقریباً دس برس پہلے۔ اس سے ہر صاحب نظر اندازہ لگا سکتا ہے کہ اس آیت کا تعلق ابوطالب سے کہاں تک ہو سکتا ہے۔ روایت ساز نے نہ اس پر نظر کی کہ یہ آیت کب نازل ہوئی اور نہ ادھر نگاہ دوڑائی کہ ابوطالب نے کب انتقال کیا۔ اسے تو اس آیت کا مصداق ابوطالب کو ثابت کرنا تھا۔ لہٰذا ایک واقعہ گڑھ کر اسے چابک دستی سے اس آیت کے ساتھ جوڑ دیا۔ تاکہ ظاہربین افراد یہ سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ ان کے حق میں دعائے مغفرت کرنے سے اپنے رسول سے منع کر دیا تھا اب ان کے کفر میں کیا شک و شبہ ہو سکتا ہے اگر اس آیت کو ابوطالب کے متعلق مانا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ پیغمبرؐ اکرم دس برس تک ابوطالب کے حق میں حسب وعدہ دعائے مغفرت کرتے رہے اور قدرت کو اس بے اثر و بے ثمر دعا سے روکنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ اور جب پیغمبر کو دعا کرتے ہوئے ایک طویل مدت گزر گئی، تو ادھر توجہ دلانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اور دعائے مغفرت سے روکنے کے لئے آیت نازل کر دی اور پیغمبرؐ اتنا عرصہ ایک ایسے فعل کے مرتکب ہوتے رہے جو تقاضائے اسلام اور منشائے خداوندی کے سراسر خلاف تھا۔ کیا ایسی بے سرو پا روایت پر کسی عقیدہ کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے یا اس کی صحت پر اعتماد کرتے ہوئے کسی کے کفر و ایمان کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔

چوتھے یہ کہ اس آیت کے نزول سے پہلے بہت سی ایسی آیتیں نازل ہو چکی تھیں جن میں واضح طور پر کفار

ومنافقین کے لئے دعائے مغفرت سے روکا جاچکا تھا۔ مثلاً یہ آیت اور اس قبیل کی دوسری آیتیں :۔

سواء علیھم استغفرلھم ام لم تستغفرلھم لن یغفر اللہ لھم۔ — تم ان کے لئے دعائے مغفرت مانگو یا نہ مانگو اُن کے لئے برابر ہے۔ خدا تو انہیں ہرگز نہیں بخشے گا۔"

یہ سورۂ منافقون کی آیت ہے اور یہ سورہ چھٹی ہجری میں سورۂ براۃ سے قبل نازل ہوا۔ لہٰذا جب پیغمبرؐ کو پہلے سے کفار ومشرکین کے لئے دعائے مغفرت سے منع کیا جاچکا تھا تو پھر پیغمبر کے یہ کہنے کا کیا محل تھا، کہ اگر مجھے منع نہ کیا گیا تو میں ان کے حق میں دعائے مغفرت کرتا رہوں گا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ممانعت کی آیتوں کے بعد کسی مشرک و کافر کے لئے دعائے مغفرت کریں اور اس طرح ایک امر ممنوع کے مرتکب ہوکر قرآنی آیات کی خلاف ورزی کریں۔ لہٰذا یہ تسلیم کرنا ناگزیر ہوگا کہ اس آیت کا ابوطالب سے دور کا تعلق بھی نہیں ہے۔ اور پیغمبر اکرمؐ انہیں مومن ومسلم سمجھ کر ان کے حق میں دعائے مغفرت کرتے رہے تھے۔ ورنہ ان کے کافر ہونے کی صورت میں اُن کے لئے دعائے مغفرت کا کوئی جواز نہ تھا۔ اور اگر اسی پر اصرار ہو کہ اسلام سے منحرف ہوتے کے باوجود ان کے لئے دعائے مغفرت کا سلسلہ جاری رکھا تو اس سے پیغمبرؐ کا دامن عصمت داغدار اور پیراہن نبوت تار تار ہو جائے گا اس لئے کہ قرآنی تعلیمات کے خلاف عمل پیرا ہونے سے عدالت بھی برقرار نہیں رہتی چہ جائیکہ نبوت۔ کیا اثباتِ کفر کی ایسی روایتیں توجہ والتفات کے قابل سمجھی جاسکتی ہیں جن سے نبوت کی توہین اور دامن رسالت کی پاکیزگی وتقدیس بھی محفوظ نہ رہتی ہو۔

پانچویں یہ کہ ترمذی نے اپنی صحیح کے باب التفسیر میں اس آیت کے شانِ نزول کے سلسلہ میں تحریر کیا ہے کہ حضرت علیؑ نے ایک شخص کو اپنے کافر ماں باپ کے حق میں دعائے مغفرت کرتے سنا۔ تو اس سے کہا کہ تم ایسے والدین کے لئے دعا کرتے ہو جو کافر ومشرک مرے تھے۔ اس نے کہا کیا حضرت ابراہیمؑ نے اپنے چچا آزر کے لئے دعائے مغفرت نہیں کی تھی حالانکہ وہ مشرک اور بت پرست تھا۔ حضرت علیؑ کہتے ہیں کہ میں نے پیغمبرؐ اکرم کی خدمت میں حاضر ہوکر یہ تمام واقعہ بیان کیا جس پر یہ آیت نازل ہوئی اور مسلمانوں کو اپنے کافر ومشرک عزیزوں کے لئے دعائے مغفرت سے منع کر دیا گیا۔

اس روایت میں چند امور فکر طلب اور قابلِ توجہ ہیں :۔

پہلا امر یہ کہ اگر کافر ومشرک عزیزوں کے لئے دعائے مغفرت جائز نہ ہوتی تو حضرت علیؑ جو اسلام کے اوامر ونواہی اور احکام وسنن کے عالم اور ان کے حکم ومصالح پر حاوی تھے کبھی اس پر معترض نہ ہوتے اور نہ اسے ٹوکنے کی ضرورت محسوس کرتے۔ امیرالمومنینؑ کا اس کی دعا پر حیرت واستعجاب اس امر کو واضح کر دینے کے لئے کافی ہے کہ کفار ومشرکین کے حق میں دعائے بخشش کسی مسلمان کا شیوہ نہیں ہو سکتا۔

دوسرا امر یہ کہ اس شخص نے اپنے عمل کے جواز کے لئے حضرت ابراہیمؑ کے عمل سے استناد کیا کہ انہوں نے بھی تو اپنے مشرک چچا کے لئے دعائے مغفرت کی تھی حالانکہ اسے ماضی کے اوراق الٹ کر اتنا دور جانے کی ضرورت نہ تھی بلکہ حضرت ابراہیمؑ کے عمل سے استناد کرنے کی بجائے پیغمبرؐ کے عمل سے استناد کرنا چاہیئے تھا کہ انہوں نے بھی تو اپنے مشرک چچا کے لئے دعائے مغفرت کی تھی مگر اس کا عمل پیغمبر کو پیش نہ کرنا بتاتا ہے کہ اس کے ذہن میں ابوطالب کے مشرک ہونے کا تصوّر بھی نہ تھا۔ اور نہ اس دور میں انہیں کوئی کافر و مشرک سمجھتا تھا اور نہ ان کے کفر و شرک کے متعلق اکابر صحابہ سے کوئی روایت وارد ہوئی ہے۔

تیسرا امر یہ کہ اس شخص نے اپنے مردہ ماں باپ کے حق میں دُعاء مغفرت کے جواز کی سند حضرت ابراہیم کے عمل میں تلاش کی حالانکہ حضرت ابراہیمؑ نے آزر کے مرنے کے بعد اس کے حق میں دعا نہیں فرمائی بلکہ جب انہیں یہ یقین ہو گیا کہ وہ راہِ ہدایت پر آنے والا نہیں ہے تو اپنی زبان بند کر لی جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:۔

وما کان استغفار ابراھیم لابیہ الا عن موعدۃ وعدھا ایاہ فلما تبین لہ انہ عدو للہ تبرا منہ۔

ابراہیمؑ کا اپنے باپ کے لئے مغفرت کی دعا مانگنا اس وعدہ کی بناء پر تھا جو انہوں نے اپنے باپ سے کیا تھا۔ اور جب ان پر واضح ہو گیا کہ وہ دشمنِ خدا ہے تو اُس سے بیزار ہو گئے۔"

حضرت ابراہیمؑ کی دعاء محض طلبِ ہدایت کے لئے تھی اور وہ یہ چاہتے تھے کہ اسے ہدایت نصیب ہو تاکہ آخرت میں بخشش و آمرزش کا مستحق قرار پائے۔ اس لئے کہ انسان زندگی میں خواہ کتنا بے راہ اور کفر و ضلالت میں ڈوبا ہوا ہو اس کے راہِ راست پر آنے سے مایوسی نہیں ہوتی اور یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ شائد وہ ضلالت و گمراہی سے نکل کر حق و ہدایت کی راہ پر آ جائے اور مرنے کے بعد تو ہدایت کے حاصل کرنے کا کوئی موقع ہی نہیں ہوتا کہ اس کے لئے ہدایت و مغفرت کی دعا کی جا سکے۔ لہٰذا اس دعائے خلیلؑ سے حالتِ کفر میں مرجانے والوں کے لئے دعائے مغفرت کا جواز ثابت نہ ہو گا۔ ان شواہد سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ کفار کے لئے دعائے مغفرت سے ممانعت اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے ہو چکی تھی اور کسی کافر کے لئے اس کے مرنے کے بعد نہ دعا کا کوئی محل ہے اور نہ کوئی وجہ جواز۔ لہٰذا پیغمبرؐ کے بارے میں یہ تصور کیونکر کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے ابوطالب کو کافر سمجھنے کے باوجود ان سے یہ کہا ہو گا کہ "اگر مجھے منع نہ کیا گیا تو میں آپ کے لئے دعائے مغفرت کرتا رہوں گا"۔ کیونکہ دعائے مغفرت امیدِ بخشش سے وابستہ ہے اور ایک کافر کے لئے بخشش کی امید کیونکر کی جا سکتی ہے جب کہ اللہ کا فیصلہ کافروں کے جہنمی ہونے کا ہو چکا ہے لہٰذا یہ مانے بغیر چارہ نہیں کہ پیغمبرؐ انہیں مومن و مسلم سمجھ کر ان کے حق میں دعائے مغفرت کرتے تھے، اور

اس دعائے مغفرت کے بعد کوئی وجہ نہیں کہ ابوطالب کے کفر پر اصرار کیا جائے جب کہ دعائے پیغمبر اُن کے ایمان کی دلیل اور ان کی مغفرت کی ناقابلِ تردید سند ہے۔

چھٹے یہ کہ اس آیت کے شانِ نزول کے بارے میں روایت مذکورہ کے علاوہ اور بھی مختلف و متعارض روایات ہیں اور روایات کے اختلاف سے واقعیت مشکوک ہو جایا کرتی ہے۔ اور کوئی بھی روایت استناد و احتجاج کے قابل نہیں رہتی۔ چنانچہ ایک روایت یہ ہے کہ جب آنحضرتؐ اپنی والدہ کی قبر کے پاس سے گزرے تو اللہ تعالیٰ سے زیارتِ قبر اور دعائے مغفرت کی اجازت مانگی۔ اللہ نے زیارتِ قبر کی اجازت دے دی اور دعائے مغفرت سے اس آیت کے ذریعہ روک دیا۔ اور ایک روایت یہ ہے کہ آنحضرتؐ نے اپنے والد کے لئے دعائے مغفرت کا ارادہ کیا جس سے روکنے کے لئے یہ آیت نازل ہوئی اور ایک روایت یہ ہے کہ کچھ مسلمانوں نے پیغمبر اکرمؐ سے اپنے کافر بزرگوں کے لئے جو مر چکے تھے دعائے مغفرت کی اجازت طلب کی۔ جس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ غرض کوئی اسے آنحضرتؐ کے چچا ابوطالب کے متعلق بتاتا ہے۔ کوئی آنحضرتؐ کے والد جناب عبداللہ کے متعلق اور کوئی آنحضرتؐ کی والدہ جناب آمنہ کے متعلق اور کوئی مسلمانوں کے کافر بزرگوں کے متعلق۔ جہاں اتنے مختلف اقوال ہوں اور ہر قول میں واقعہ کی نوعیت مختلف طریقوں سے بیان کی گئی ہو اور روایات کے تعارض اور رواۃ کی کثرت تعبیر نے اسے خواب پریشاں بنا کر رکھ دیا ہو اور پھر اس میں بھی اختلاف ہو کہ آیا استغفار سے مراد دعائے مغفرت ہے یا نمازِ جنازہ جو حضرت ابوطالب کی وفات تک مشروع و نافذ ہی نہ ہوئی تھی۔ وہاں اس کا مورد صرف ابوطالب کو قرار دے کر ان کے کفر پر اصرار کرنا کہاں تک حق و انصاف کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو سکتا ہے کیا ہمیں یہ اختیار دے دیا گیا ہے کہ ہم اپنی مرضی سے جسے چاہیں اسے مسلمان اور جسے چاہیں اسے کافر قرار دے لیں۔

دوسری روایت یہ بیان کی جاتی ہے کہ جب ابوطالب کا وقت رحلت قریب آیا تو پیغمبرؐ نے اُن سے فرمایا کہ چچا کلمہ پڑھیے تاکہ میں اللہ تعالیٰ کے سامنے آپ کے ایمان کی گواہی دے سکوں۔ ابوطالب نے انکار کیا اور کہا کہ اگر قریش کے طعن و تشنیع کا ڈر نہ ہوتا تو میں کلمہ پڑھ لیتا جس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاءُ۔	تم جسے دوست رکھتے ہو اسے تم ہدایت نہیں کرتے مگر خدا جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے۔"

یہ روایت بھی متعدد وجوہ سے درخورِ اعتنا نہیں ہے۔

اوّلاً یہ کہ یہ روایت محمد ابن عباد، ابن ابی عمر وغیرہ کے واسطہ سے ابوہریرہ دوسی سے اور عبدالقدوس شامی اور ابوسہل السری کے واسطہ سے ابن عمر اور ابن عباس سے نقل کی گئی ہے اور یہی امر اس کی افسانوی حیثیت کو

کو بے نقاب کرنے کے لئے کافی ہے اس لئے کہ ان میں ابو ہریرہ ابو طالب کے انتقال کے موقع پر اپنی جنم بھومی یمن میں تھے اور ۷ھ میں جب کہ حضرت ابو طالب کو انتقال کئے دس برس گزر چکے تھے اسلام لائے تھے۔ لہٰذا ابو طالب کی نزعی حالت کے موقع پر ان کے موجود ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ اس واقعہ کے عینی شاہد ہوں اور پیغمبرؐ کو تلقین کرتے اور ابو طالب کو انکار کرتے اپنے کانوں سے سنا ہو۔ اگر کسی سے سن لیا تھا تو اس کا نام لینے میں کیا امر مانع تھا۔ جب کہ یہ واقعہ اُن کے زمانۂ کفر اور مکہ میں عدم موجودگی کا ہے۔ اور پھر ابو طالب کے بارے میں ان کی روایت اس اعتبار سے بھی ساقط الاعتبار ہے کہ وہ معاویہ کے خصوصی مصاحبوں اور حاشیہ نشینوں میں سے تھے اور یہ مصاحبت و وابستگی حضرت علیؑ سے دشمنی و عناد کی دلیل ہے۔ کیونکہ ان سے انحراف و عناد کے بغیر نہ دربارِ شام میں تقرب حاصل ہو سکتا تھا اور نہ معاویہ کی مصاحبت کا شرف۔ ابن ابی الحدید نے اس دشمنی و عناد کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ جب وہ معاویہ کے ہمراہ کوفہ میں آئے تو راتوں کو باب کندہ کے پاس آکر بیٹھ جاتے کچھ لوگ بھی ان کے گرد و پیش جمع ہو جاتے۔ ایک مرتبہ اصبغ ابن نباتہ بھی اُن کے حلقہ میں آکر بیٹھ گئے اور ان سے کہا کہ کیا تم نے علیؑ کے بارے میں پیغمبرؐ کا یہ ارشاد سنا ہے:۔ اللّٰھم وال من والاہ وعاد من عاداہ۔" خدا اسے دوست رکھ جو علیؑ کو دوست رکھے اور اسے دشمن رکھ جو علیؑ کو دشمن رکھے۔" کہا ہاں سنا ہے۔ اس پر اصبغ نے کہا:۔

فاشھد باللّٰہ لقد والیت عدوہ وعادیت ولیہ۔

(شرح نہج۔ ج ۱۔ صفہ ۳۶۰)

"تو پھر میں اللہ کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ تم نے ان کے دشمنوں سے دوستی گانٹھ رکھی ہے اور اُن کے دوستوں سے دشمنی پر اُتر آئے ہو۔"

اسی دشمنی کا نتیجہ یہ تھا کہ معاویہ نے انہیں مدینہ کی حکومت سونپ دی اور ہمیشہ ان پر نظر خصوصی رکھتے تھے اور ان کے مرنے کے بعد بھی ان کے وارثوں سے حسن سلوک کرتے رہے۔ چنانچہ جب ان کے مرنے کی اطلاع آئی تو اپنے عامل ولید ابن عقبہ کو لکھا:۔

انظر من ترك فادفع الی ورثتہ عشرۃ آلاف درھم واحسن جوارھم وافعل الیھم معروفاً فانہ کان ممن نصر عثمان وکان معہ فی الدار۔

(طبقات ابن سعد۔ ج ۴۔ صفہ ۳۴۰)

"اس کے وارثوں کو تلاش کر کے انہیں دس ہزار درہم دو اور ان سے حسن سلوک اور نیک برتاؤ کرو اس لئے کہ وہ ان لوگوں میں سے تھا جنہوں نے حضرت عثمان کی نصرت کی اور محاصرہ کے دنوں میں اُن کے گھر میں موجود رہے۔"

معاویہ سے وابستگی اور اموی خاندان سے لگاؤ کے ساتھ کثیر الروایہ بھی تھے اور پیغمبر اکرمؐ کی صحبت میں انتہائی کم عرصہ رہنے کے باوجود روایتِ حدیث میں ان تمام لوگوں سے سبقت لے گئے جو مدتوں پیغمبرؐ کی صحبت میں اٹھتے بیٹھتے رہے اور ان کے ارشادات سے مستفید ہوتے رہے تھے۔ اس کثرتِ روایت نے ان کی روایات کو مشکوک و بے اعتماد بنا دیا تھا۔ اور حضرت عمرؓ نے بھی ان کی روایات کی سبکی و بے وزنی کو محسوس کرتے ہوئے انہیں کثرتِ روایت پر سرزنش کی تھی اور کہا تھا:۔

لتترکن الحدیث عن رسول اللہ او لالحقنك بارض دوس۔ (سیر اعلام النبلاء ، صہ ۴۳۴)	حدیث بیانی کو چھوڑ دو۔ اگر تم نے اس پر عمل نہ کیا تو میں تمہیں قبیلۂ دوس کی سرزمین کی طرف چلتا کروں گا۔"

یہ اس صورت میں کہ ابھی احادیث کا بیشتر ذخیرہ ان کے حافظہ کی تہوں میں محفوظ پڑا تھا اور اسے "ناگفتہ بہ" سمجھ کر نظر انداز کر دیا تھا۔ چنانچہ خود ہی کہتے ہیں:۔

لو انبأتکم بکل ما اعلم لرمانی الناس بالخزف وقالوا ابوھریرۃ مجنون۔ (طبقات ابن سعد۔ ج ۴۔ صہ ۳۳۱)	جو کچھ میں جانتا ہوں اگر سب بتانے لگوں تو لوگ مجھے ٹھیکرے ماریں اور کہیں کہ ابوہریرہ تو باؤلا ہے۔"

حضرت علیؑ بھی نقلِ حدیث میں ان کی راست گوئی و صدق بیانی کے قائل نہ تھے بلکہ انہیں دروغ گو سمجھتے تھے چنانچہ آپ نے فرمایا:۔

الا ان اکذب الناس علی رسولُ اللہ ابوھریرۃ الدوسی۔ (شرح ابن ابی الحدید۔ ج ۱۔ صہ ۳۶)	ابوہریرہ سب سے زیادہ رسول اللہ پر جھوٹ باندھتا تھا۔"

اسی طرح ابنِ عمر کا بھی وفاتِ ابوطالب کے موقع پر موجود ہونا قرینِ قیاس نہیں ہے کیونکہ وہ بعثت کے تین سال بعد پیدا ہوئے۔ اس لحاظ سے ابوطالب کے انتقال کے وقت ان کی عمر سات سال بنتی ہے۔ اور ایک سات برس کے بچے کا ایسے مقام پر گذر ہی کہاں ہو سکتا ہے جہاں سردارِ قریش حالتِ احتضار میں پڑا ہو اور بنی ہاشم و عمائدِ قریش اس کے گرد و پیش جمع ہوں اور اگر گزر ہوا بھی ہو تو آنحضرتؐ اور ابوطالبؑ کی گفتگو سننا، اسے سمجھنا اور محفوظ رکھنا اس سے زیادہ بعید از قیاس ہے۔ لہٰذا وہ بھی اس واقعہ کے عینی شاہد نہیں ہو سکتے۔ اور جب تک یہ نہ معلوم ہو کہ انہوں نے کس سے سنا ان کی روایت کو کوئی وزن نہیں دیا جا سکتا اور نہ اس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے جب کہ ابنِ عمر ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے خلیفۂ ثالث کے

بعد حضرت علیؑ کے ہاتھ پر بیعت کرنے سے انکار کر دیا تھا اور ہمیشہ ان سے منحرف و برگشتہ ہی رہے۔ باقی رہے ابن عباس تو وہ ہجرت سے تین سال قبل شعب ابو طالب میں پیدا ہوئے تھے اور اسی سال حضرت ابو طالب نے انتقال فرمایا تھا۔ لہٰذا ان کے بھی وہاں موجود ہونے اور گفتگو سننے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ یہ کون باور کرے گا کہ ایک دودھ پیتے بچے نے حضرت ابو طالب کی زبان سے کچھ سنا اور اسے بیان کیا۔ اگر انہوں نے کسی سے سنا تھا تو اس کا نام لیتے تاکہ اُسے دیکھ کر روایت کا وزن قائم کیا جاتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کچھ معاندین نے اس روایت کو گڑھ کر ابن عباس کی طرف منسوب کر دیا ہے تاکہ دیکھنے والے ان کا نام دیکھ کر خاموش ہو جائیں اور ان کی جلالت قدر کے پیشِ نظر یہ غور کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کریں کہ وفاتِ ابو طالب کے وقت ان کی عمر کیا تھی اور وہ روایت کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے تھے یا نہیں۔

اس کے علاوہ ابو ہریرہ کے سلسلۂ روایت میں محمد ابن عباد ہوں یا ابن ابی عمر یا ابن کیسان۔ مجہول ہیں یا مشتبہ۔ اور ابن عمر اور ابن عباس کے سلسلۂ روایت میں عبد القدوس شامی ہوں یا ابو سہل سری یہ دونوں علماء رجال کے نزدیک حدیث ساز ہیں اور کاذب۔

دوسرے یہ کہ جب پیغمبرؐ اسلام آیہ قرآنی: وانذر عشیرتک الاقربین۔ "اپنے قریبی عزیزوں کو ڈراؤ" کے تحت اپنے رشتہ داروں اور کنبہ والوں کو خصوصی طور پر دعوتِ اسلام دینے پر مامور تھے اور آپ نے اس آیت کے نزول کے بعد علانیہ تبلیغ ابو طالب ہی کے گھر سے شروع کی تھی، تو پھر کیا وجہ ہے کہ دوسرے عزیزوں اور قریبیوں کو دعوتِ اسلام دیتے رہے اور ابو طالب کو تبلیغ کرنے اور کلمہ پڑھوانے کا خیال اس وقت آتا ہے کہ جب وہ بستر بیماری پر موت و حیات کی کشمکش میں تھے اور دس سال کے طویل عرصہ میں انہیں دعوتِ اسلام دینے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے کیا آنحضرتؐ نے فریضۂ تبلیغ کی ادائیگی میں عمداً کوتاہی و سہل انگاری سے کام لیا یا ابو طالب کی امداد و تعاون کو برقرار رکھنے کے لئے انہیں اپنے معتقدات بدلنے کی ہدایت نہیں کی۔ تاکہ وہ بددل ہو کر ان کی حمایت و نصرت سے دستکش نہ ہو جائیں۔ پہلی صورت میں یہ لازم آتا ہے کہ پیغمبرؐ نے ادائے فرائض میں غفلت برتی اور حکم خصوصی کے باوجود انہیں دعوتِ اسلام دینے میں تعویق کی۔ اور یہ ایک نبی کے شایان شان نہیں ہو سکتا کہ وہ فرائض میں کوتاہی کا مرتکب ہو اور حکم خدا کی خلاف ورزی کرے اور دوسری صورت میں خود غرضی کا پہلو نمایاں ہے کہ آپ نے صرف مطلب برآری و مقصد جوئی کے لئے انہیں اپنے عقائد بدلنے کے نہیں کہا۔ اور یہ خود غرضانہ روش کسی کی بھی بلند سطح انسان کو زیب نہیں دیتی چہ جائیکہ پیغمبرؐ مداہنت و خود غرضی سے کام لیں اور کسی کی طرف داری سے فائدہ اٹھانے کے لئے اسے غلط نظریات و عقائد پر باقی رہنے دیں اور تبلیغ و دعوت کے بجائے خاموشی اختیار کریں۔ اب ایک

صورت یہ رہ جاتی ہے کہ پیغمبرؐ ان کے اسلام و ایمان پر شروع سے مطمئن تھے اور ان کے اعمال و افعال کو ان کے عقاید کی ترجمانی کے لئے کافی و وافی سمجھتے تھے اور بلاشبہ ان کا ہر فعل و عمل اسلام کے نظریات کے عین مطابق تھا جس کے بعد ضرورت ہی نہ تھی کہ آخر وقت میں جب کہ ایمان تو درکنار، توبہ بھی قابلِ قبول نہیں ہوتی ان سے کلمہ پڑھواتے اور اس لفظی اقرار پر ان کے ایمان کی شہادت کو اٹھا رکھتے۔

تیسرے یہ کہ اس آیت کے شانِ نزول کے سلسلہ میں اور بھی متعدد روایات اور مختلف اقوال ہیں۔ ان میں سے ایک روایت یہ ہے کہ جنگ اُحد میں جب آنحضرتؐ کے دندان مبارک شہید ہوئے تو آپ نے دست بدعا ہو کر کہا بار الٰہا تو ان لوگوں کو ہدایت فرما یہ جاہل و بے خبر ہیں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اور ایک روایت یہ ہے کہ یہ حارث ابن نعمان کے بارے میں نازل ہوئی۔ آنحضرت چاہتے تھے کہ وہ مسلمان ہو جائے مگر وہ اسلام سے گریزاں ہی رہا اور حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ:۔

نزلت انك لا تهدی من احببت وانا مع النبیؐ فی اللحاف۔ (مرقاۃ برحاشیہ ترمذی۔ جلد ۲۔ صؔ ۹۶)	آیت "انك لا تهدی من احببت" اس وقت نازل ہوئی جب میں رسولؐ اللہ کے ساتھ لحاف میں تھی۔"

غرض اس طرح کی اور بھی روایات ہیں جو ایک دوسرے سے متعارض و مختلف ہیں۔ اس اختلاف کو دیکھتے ہوئے زیرِ نظر روایت کی صحت مشکوک ہو جاتی ہے خصوصاً جب کہ اس کے رواۃ بھی پایۂ اعتبار سے ساقط اور ناقابلِ اعتماد ہیں۔ اور پھر پہلی روایت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ آیت ابوطالب کی وفات کے چھ برس بعد نازل ہوئی اس لئے کہ جنگ اُحد ۳ھ میں واقع ہوئی اور ابوطالب ہجرت سے تین سال پہلے وفات پاچکے تھے اور حضرت عائشہ کے قول سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ آیت ابوطالب کی وفات کے تین چار سال بعد نازل ہوئی اس لئے کہ حضرت عائشہ کی رخصتی ۱ھ میں عمل میں آئی اور ابوطالب کو وفات پائے تین چار سال کا عرصہ گذر چکا تھا لہٰذا کسی طرح اس آیت کا تعلق ابوطالب سے نہیں ہو سکتا جب کہ وہ نزولِ آیت کے موقع پر دنیا میں موجود ہی نہ تھے اور دنیا سے اُٹھ جانے کے بعد نہ ہدایت کرنے کا کوئی موقع ہوتا ہے اور نہ انکار کرنے کا کوئی محل۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ آیت اس موقع پر بھی نازل ہوئی اور بعد کے مواقع پر بھی تو تکرار نزول کو خلافِ اصل ہونے کی بنا پر اس وقت تک تسلیم نہیں کیا جا سکتا جب تک اس پر کوئی دلیل قائم نہ ہو۔

چوتھے یہ کہ اگر اس آیت کو ابوطالب کے بارے میں تسلیم کر لیا جائے جب بھی اُن کے ایمان کی نفی نہیں ہوتی اس لئے کہ اس آیت کا نہج و اسلوب وہ ہے جو آیۂ قرآنی ما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمی (اے رسولؐ جب تم نے تیر پھینکا تو تم نے نہیں پھینکا بلکہ خدا نے پھینکا) کا ہے۔ اس میں ما رمیت سے رمی کی نفی بھی

ہے اور ادہ دمیت سے اثبات بھی۔ اثبات اس بنا پر کہ یہ عمل پیغمبرؐ کے ہاتھوں انجام پایا اور نفی اس بناء پر کہ درحقیقت یہ اللہ تعالیٰ کی کارفرمائی تھی۔ اسی طرح آیت میں ہدایت کا اثبات بھی ہے اور ہدایت کی نفی بھی۔ نفی کی نسبت رسولؐ کی طرف ہے اور اثبات کی نسبت اللہ کی طرف۔ مطلب یہ ہے کہ اگرچہ یہ ہدایت بظاہر پیغمبرؐ کی تبلیغ وتلقین کے ذریعہ ہوئی مگر حقیقۃً اللہ تعالیٰ کی امداد و تائید کا نتیجہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی ہدایت کا اصل سرچشمہ ہے۔ اگر اس کی توفیق و تائید شامل حال نہ ہو تو کوئی بھی راہِ ہدایت پر نہیں آسکتا اور نہ اس کے ارادہ ومشیت کے بغیر ہدایت ورہنمائی کسی کے بس کی بات ہے۔ اور پیغمبر اس ہدایت کے سلسلہ میں صرف ایک واسطہ و ذریعہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ اب آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ جنہیں آنحضرت دوست رکھتے ہیں۔ انہیں ہدایت کرنے سے قاصر ہیں یا ان کی ہدایت ان پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ بلکہ معنی یہ ہوں گے کہ جنہیں رسولؐ دوست رکھتا ہے انہیں رسولؐ ہدایت نہیں کرتا بلکہ اللہ انہیں ایمان کی راہ دکھاتا ہے اور یہی معنی زیادہ نمایاں اور واضح ہیں اور اسی کی قرآنی آیات سے تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے:۔

لیس علیك هداهم ولكن الله یهدی من یشاء	اے رسولؐ! ان لوگوں کی ہدایت کی ذمہ داری تم پر نہیں ہے لیکن خدا جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے۔"

اس ہدایت کی نسبت خصوصی سے اس کی خصوصی و امتیازی حیثیت بھی کھل کر سامنے آجاتی ہے اس طرح کہ ابوطالب کا ایمان پیغمبرؐ کی دعوتِ عمومی کی بناء پر نہ تھا بلکہ اس میں اللہ کی مشیت بھی کارفرما تھی لہٰذا اس آیت سے نفی ایمان کے بجائے ان کے ایمان و یقین کی فوقیت کا بھی اثبات ہوگا۔ چنانچہ اُن کی اسلامی خدمات ان کے رسوخِ ایمان کی آئینہ دار اور یقین کی بلند پائیگی کا واضح ثبوت ہیں۔

پانچویں یہ کہ اس آیت کو ابوطالب کے بارے میں مان لینے کی صورت میں یہ تسلیم کرنا ناگزیر ہوگا کہ آنحضرت انہیں دوست رکھتے تھے اور واقعات بھی اس کے شاہد ہیں کہ پیغمبرؐ ان سے بیحد محبت ووابستگی رکھتے تھے۔ بلکہ اس محبت کی نسبت سے عقیل سے بھی محبت کرتے تھے۔ چنانچہ ابوطالب کی وفات کے بعد عقیل سے ایک موقع پر فرمایا:۔

انی احبك حبین حبا لقرابتك منی وحبا لحب ابی طالب ایاك۔	میں تمہیں دو جہتوں سے دوست رکھتا ہوں۔ ایک تم سے قرابت کی بناء پر اور دوسرے ابوطالب کی محبت کی وجہ سے کہ وہ تمہیں دوست رکھتے تھے۔"
(تاریخ اسلام ذہبی۔ ج ۲۔ ص ۲۳۳)	

یہ محبت ابوطالب کے ایمان کا واضح ثبوت ہے اس لئے کہ پیغمبر کسی کافر ومشرک کو دوست نہیں رکھ سکتے خواہ وہ آپ کا کتنا ہی قریبی عزیز کیوں نہ ہو۔ چنانچہ خداوند عالم کا ارشاد ہے:۔

لا تجد قوما یومنون باللہ والیوم الاخر یوادون من حاد اللہ ورسولہ ولو کانوا اباءھم او ابناءھم او اخوانھم او عشیرتھم۔

جو لوگ اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں تم انہیں اللہ اور اس کے رسولؐ کے دشمنوں سے دوستی کرتے ہوئے نہ پاؤ گے اگرچہ وہ اُن کے باپ یا بیٹے یا بھائی یا قوم قبیلے والے ہی کیوں نہ ہوں۔"

جب اہلِ ایمان کو کفار و مشرکین سے دوستی و محبت اور راہ و رسم رکھنے سے منع کیا گیا ہے اگرچہ وہ ان کے عزیز و اقارب اور قوم و قبیلہ والے کیوں نہ ہوں۔ تو پیغمبرؐ اکرم سے کیونکر یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ ایک مشرک و غیر مومن سے محبت و دوستی روا رکھیں گے جب کہ کافر و مشرک دشمنِ خدا ہے اور دشمنِ خدا اس کے رسول کا محبوب نہیں ہو سکتا تو درصورتیکہ ابو طالب سے پیغمبرؐ کی محبت ناقابلِ انکار ہے تو پھر ان کے ایمان سے انکار کا جواز بھی پیدا نہیں کیا جا سکتا۔

چھٹے یہ کہ یہ امر درایت کے سراسر منافی ہے کہ جس نے اپنی زندگی کے لمحات پیغمبرؐ کی نصرت و حمایت کے لئے وقف کر دیئے ہوں علانیہ اسلام کی تائید کرتے رہے ہوں۔ قریش کے بھرے مجمعوں میں آنحضرتؐ کے دین کو بہترین دین کہا ہو، انہیں انبیائے سلف کی طرح کا ایک نبی مانا ہو، ان سے حفاظت دین کا عہد کیا ہو اور کٹھن سے کٹھن موقعوں پر کسی قوت و طاقت سے مرعوب نہ ہوئے ہوں اور نہ اعلانِ حق میں کبھی خوف و ہراس محسوس کیا ہو وہ آخر وقت محض قریش کی خاطر یا ان کے طعن و تشنیع سے گھبرا کر کلمہ توحید پڑھنے سے انکار کر دیں اور اس دین سے منہ موڑ لیں جسے ہمیشہ سچا سمجھا اور سچا کہا ہو اور جسے کڑیاں جھیل کر پروان چڑھایا ہو۔ تیسری روایت یہ ہے کہ ابن عباس سے ایک شخص نے سنا کہ آیت وھم ینھون عنہ وینأون عنہ۔ ابو طالب کے بارے میں نازل ہوئی اور اسے ابو طالب پر منطبق کرنے کے لئے اس کے معنی یہ کئے گئے ہیں کہ" وہ رسولؐ سے کفار کی ایذا رسانیوں کو روکتے ہیں اور خود رسول سے دور بھاگتے ہیں" اور ان کے نزدیک ابو طالب کی یہی حالت تھی کہ وہ مشرکین و کفار سے پیغمبرؐ کا دفاع تو کرتے رہے مگر اُن پر ایمان نہ لائے اور معنوی لحاظ سے اُن سے دور رہے۔

یہ روایت بھی پایۂ اعتبار سے ساقط اور ناقابلِ اعتبار و اعتماد ہے۔

اوّلاً یہ کہ یہ روایت مرسل ہے اور اس میں اس شخص کی نشاندہی نہیں کی گئی جو ابن عباس اور اس کے راوی حبیب ابن ابی ثابت کے درمیان واسطہ ہے۔ جب راوی نے خود ابن عباس سے اسے نہیں سنا اور نہ اس شخص کا نام لیا ہے جس نے ابن عباس سے سنا تھا، تو ایک مجہول الاسم والرسم شخص کی روایت پر اعتماد کرتے ہوئے اسے ابو طالب کے متعلق کیونکر تسلیم کیا جا سکتا ہے جب کہ حبیب ابن ابی ثابت علماء رجال کے نزدیک جعل ساز اور افتراء پرداز بھی ہے۔ دوسرے یہ کہ آیت کا مورد و محل اور سیاق و سباق سے صاف ظاہر ہے کہ یہ

آیت کفار و مشرکین کے ایک گروہ کے متعلق ہے جو قرآن کو اساطیر الاولین "پرانے لوگوں کے قصّے کہانیوں" سے تعبیر کرتا تھا چنانچہ صاحب کشاف اور علامہ بیضاوی نے تحریر کیا ہے کہ ابوسفیان، ولید، عتبہ، شیبہ، ابوجہل، نضر ابن حارث اور چند دوسرے مشرکین نے آنحضرتؐ کو قرآن مجید کی آیتیں پڑھتے سنا تو انہوں نے نضر ابن حارث سے پوچھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) یہ کیا پڑھتے ہیں؟ اس نے کہا کہ اساطیر الاولین "پہلے لوگوں کے قصے کہانیاں" اور اس آیت کے پہلے ٹکڑے میں اسی کا تذکرہ ہے:۔ ویقول الذین کفروا ان ھی الا اساطیر الاولین۔ کافر یہ کہتے ہیں کہ یہ قرآن اگلے لوگوں کے قصے کہانیوں کے سوا کچھ نہیں ہے" اور آیت کے آخری ٹکڑے میں ان کی بے راہرویوں اور گمراہیوں کے نتیجہ میں ان کی ہلاکت و تباہی کا تذکرہ ہے:۔ و ان یھلکون الا انفسھم وما یشعرون۔ اور وہ خود ہی اپنے کو ہلاکت میں ڈالتے ہیں اور کچھ شعور نہیں رکھتے" ان دو ٹکڑوں کے درمیان و ھم ینھون عنہ وینأون عنہ کا ٹکڑا ہے۔ اگر ینھون عنہ کا مطلب یہ لیا جائے کہ وہ پیغمبر سے ایذا رسانیوں کو روکتے ہیں تو پوری آیت بے ربط اور اس کا تسلسل درہم برہم ہو جائے گا۔ اس لئے کہ آیت میں انہی چیزوں کا ذکر ہوتا آرہا ہے جو مذموم و قابل نفرین ہیں اور جن کی پاداش میں ہلاکت و تباہی ضرور ہے۔ مگر پیغمبرؐ سے ایذا و گزند کو روکنا اور انہیں کفار کی شر انگیزیوں سے بچانا ایک غیر مذموم اور قابل ستائش عمل اور اس کا پہلے اور آخری ٹکڑے سے کوئی ربط نہیں ہے۔ لہٰذا وھم ینھون عنہ کا یہ ترجمہ کہ وہ لوگوں کو پیغمبرؐ کے اتباع یا قرآن کے سننے سے روکتے ہیں" صحیح و درست ہوگا اور ماقبل و مابعد سے مرتبط ہوگا۔ چنانچہ ابن کثیر اور فخر الدین رازی نے انہی معنوں کو ترجیح دیتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ آیت ان مشرکین کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو اتباع پیغمبرؐ سے روکتے اور قرآن کے سننے سے مانع ہوتے تھے۔ لہٰذا جب تک یہ ثابت نہ ہو جائے کہ ابوطالب لوگوں کو آنحضرتؐ کے اتباع یا قرآن کے سننے سے روکتے تھے اس آیت کا تعلق اُن سے ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن حضرت ابوطالب کے متعلق قرآن کے سننے یا پیغمبر کی اطاعت سے روکنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ دوست و دشمن سبھی معترف ہیں کہ انہوں نے کسی موقع پر نہ قرآن سننے سے منع کیا اور نہ آنحضرتؐ کے اتباع سے روکا۔ اور نہ خود ان کے ہدایات و تعلیمات سے سرِ مُو انحراف کیا۔ بلکہ اپنی پوری زندگی آنحضرتؐ کی حمایت اور ان کے اتباع و پیروی میں گزار دی۔ اسے دیکھتے ہوئے یہ چیز دیانت سے بمراحل دور ہو گی کہ آیت میں تحریفِ معنوی کر کے اسے ابوطالب پر چسپاں کرنے کی کوشش کی جائے اور آیت کا ماقبل و مابعد سے ربط توڑ کر اور اسے من مانے معنی پہنا کر ابوطالب ایسے جاں نثارِ اسلام کا کفر ثابت کیا جائے۔ آخر انہوں نے کس موقع پر پیغمبرؐ سے دوری ظاہر کی اور ان سے منہ موڑ کر علیحدہ ہوئے؟ کیا نصرتِ رسولؐ و دفاعِ اسلام کا نام کفر ہے؟

"یہ اگر کفر ہے پھر کیا ہے مسلمان ہونا"

چوتھی روایت وہ ہے جسے عباس ابن عبدالمطلب سے نسبت دی گئی ہے کہ انہوں نے آنحضرتؐ سے کہا کہ ابوطالب آپ کی حمایت ونصرت میں سرگرم عمل رہے ہیں کیا انہیں اس سے کوئی فائدہ پہنچے گا، یہ ساری محنتیں اور کاوشیں رائیگاں جائیں گی؟ آنحضرتؐ نے فرمایا وہ ٹخنوں تک دوزخ کے اندر ہیں۔ اگر میں ان کی سفارش نہ کرتا تو وہ جہنم کے نیچے والے طبقہ میں ہوتے۔

یہ روایت بھی موضوع اور خود ساختہ ہے۔

اوّلاً یہ کہ یہ روایت عباس ابن عبدالمطلب سے منسوب کی جاتی ہے حالانکہ عباس کی یہ روایت درج کی جا چکی ہے کہ ابوطالب نے رسول اللہؐ کے کہنے سے کلمہ پڑھا اور توحید و رسالت کا اقرار کرتے کے بعد دنیا سے رخصت ہوئے کیا ایک ہی شخص کی طرف اسلام اور کفر دو متضاد باتوں کی نسبت سے روایت کا کوئی وزن باقی رہ جاتا ہے؟

دوسرے یہ کہ اس روایت اور اس مطلب کی دوسری روایتوں میں نفس مضمون کے لحاظ سے ایک گونہ تعارض و اختلاف پایا جاتا ہے۔ کسی روایت میں یہ ہے کہ شفاعت ہو چکی ہے اور وہ جہنم کی اوپر والی سطح پر پہنچ چکے ہیں اور کسی روایت میں ہے کہ یہ شفاعت قیامت کے دن ہو گی اور کسی میں صرف عذاب میں تخفیف کا ذکر ہے۔ اور شفاعت رسولؐ کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ اس قسم کے اختلاف سے روایت کی صحت مشکوک ہو جایا کرتی ہے اور اس پر اعتماد و وثوق نہیں رہتا۔

تیسرے یہ کہ ان روایتوں کے راوی کذّاب، جعل ساز اور ناقابلِ اعتماد ہیں۔ چنانچہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں ان روایتوں کے رواۃ میں سے سفیان کے بارے میں یکتب عن الکذ ابین (جھوٹوں سے روایت نقل کرتا ہے) اور عبدالملک ابن عمیر کے بارے میں ضعیف یغلط (ضعیف اور غلط بیان ہے) اور عبدالعزیز دراوردی کے متعلق سیئ الحفظ (حافظہ صحیح نہیں ہے) کے آراء نقل کئے ہیں۔ اور اسی طرح کے چند رواۃ اور ہیں، جو مجہول الحال اور علمائے رجال کے نزدیک ساقط الاعتبار ہیں لہٰذا ایسے لوگوں کی روایت پر بنا رکھتے ہوئے نہ کسی کے کفر و اسلام کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے اور نہ جنتی و دوزخی ہونے کا۔

چوتھے یہ کہ یہ روایت بتاتی ہے کہ آنحضرتؐ نے ابوطالب کے عملِ پیہم اور جہدِ مسلسل کے پیش نظر اُن کے حق میں شفاعت کی جس کے نتیجہ میں اس عذاب میں جس کے مستحق تھے تخفیف ہوئی حالانکہ کفار و مشرکین کے حق میں نہ شفاعتِ رسولؐ کا سوال پیدا ہوتا ہے اور نہ تخفیفِ عذاب کا۔ چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے:۔

ونسوق المجرمین الی جھنم ۔۔۔ ہم گنہگاروں کو جہنم تک پیاسے جانوروں کی طرح

ودد الا یملکون الشفاعۃ الا من اتخذ عند الرحمٰن عھدا

ہنکالے جائیں گے اس وقت شفاعت کا حاصل کرنا ان کے بس میں نہ ہوگا۔ مگر وہ جس سے خدا نے اقرار (توحید) لے لیا ہو۔"

دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے :۔

والذین کفروا لھم نار جھنم لا یقضی علیھم فیموتوا ولا یخفف عنھم من عذابھا۔

جو لوگ کافر ہوئے ان کے لیئے دوزخ کی آگ ہے نہ ان کی قضا آئے گی کہ وہ مر جائیں اور نہ ان کے عذاب میں تخفیف کی جائے گی۔"

ابن اثیر نے لکھا ہے :۔

قال القاضی عیاض انعقد الاجماع علیٰ ان الکفار لا تنفعھم اعمالھم ولا یثابون علیھا بنعیم ولا تخفیف عذاب (جامع الاصول ج ۱ ۔ صہ ۳۵۹)

قاضی عیاض کہتے ہیں کہ اس پر اجماع ہے کہ کفار کو ان کے اعمال فائدہ نہیں دیں گے اور نہ انہیں نعمت کی صورت میں اجر ملے گا نہ تخفیف عذاب کی صورت میں۔"

جب یہ روایت قرآن مجید کے نصوص واضحہ اور اجماع امت کے سراسر خلاف ہے تو اس پر اعتماد کیسا۔ بلکہ اس کے راوی ثقہ و عادل بھی ہوتے جب بھی اس پر اعتماد صحیح نہ تھا چہ جائیکہ قرآن کے خلاف ہونے کے ساتھ اس کے راوی بھی غیر ثقہ اور ناقابل اعتماد ہیں۔

پانچویں یہ کہ وہ نبیٔ رحمت و پیکرِ رأفت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اتنا نہ کر سکتے تھے کہ جب ان کے حق میں سفارش کر کے انہیں جہنم کی تہ سے نکال کر اوپر والی سطح پر لے آئے تھے تو اُن کی اسلامی خدمات اور کم از کم اسلام دوستی کی بناء پر کہ جس سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا انہیں جہنم سے نکال کر جنت میں نہ سہی اعراف میں پہنچا دیتے جب کہ اس قسم کی مراعات کفر کے باوجود نوشیروان کے لیئے اس کی عدالت کی وجہ سے اور حاتم کے لئے اس کی سخاوت کی وجہ سے تجویز کی جاتی ہے بلکہ ایک طرح کی مراعات ابولہب ایسے کافر و دشمنِ اسلام کے لئے بھی تجویز کی گئی ہے۔ چنانچہ مشہور عالم اہلحدیث وحید الزمان نے کتب صحاح سے نقل کیا ہے کہ: "ایک شخص نے ابولہب کو خواب میں دیکھا۔ اس نے بیان کیا کہ پیر کے دن کچھ پانی پینے کے لئے مجھ کو مل جاتا ہے۔ یہ اس کی جزا ہے جو میں نے ثویبہ کو آنحضرتؐ کی ولادت کی خوشی میں آزاد کر دیا تھا۔" (لغات الحدیث باب الضاد ۔ صہ ۱۲) اور ایک روایت اس طرح ہے کہ آنحضرتؐ نے ابولہب کو خواب میں دیکھا کہ وہ پیاس سے بے حال ہے۔ لیکن کچھ سیرابی کا بھی سامان ہے۔ آنحضرتؐ نے پوچھا کہ یہ سیرابی کس بناء پر ہے؟ کہا :۔

بعتقي ثويبة لانها ارضعتك۔ (تاریخ یعقوبی۔ ج ۲۔ ص ۹)
"ثویبہ نے آپ کو دودھ پلایا تھا اور میں نے اُسے آزاد کر دیا تھا، یہ اس کی جزا ہے۔"

کتنی حیرت انگیز ہے یہ چیز کہ ابولہب کے لئے اتنی سی بات پر سیرابی کو تجویز کیا جاتا ہے کہ اس نے اپنی کنیز ثوبیہ کو آنحضرتؐ کی ولادت کی خوشی میں یا انہیں دودھ پلانے کی وجہ سے آزاد کر دیا تھا حالانکہ ابولہب رسول اللہؐ کے دشمنوں کی صف اول میں تھا اور انہیں جھٹلانے، ایذا دینے اور ان کا تمسخر اڑانے میں پیش پیش تھا اور زندگی کی آخری گھڑیوں تک کفر و عناد پر قائم رہا تھا۔ اور ابوطالب جو اپنی زندگی آنحضرتؐ کی حفاظت و نصرت کے لئے وقف کئے ہوئے تھے۔ ان کی محنت و جانفشانی کے صلہ میں اتنا بھی نہیں ہوتا کہ اُن کے لئے بھی تھوڑی بہت سیرابی کو تجویز کر دیا جاتا۔ کیا رسولؐ کی تربیت و کفالت اور اسلام کی نصرت و حمایت کا درجہ ایک کنیز کے آزاد کر دینے سے بھی کمتر ہے۔ اور پھر شفاعت کے بعد حضرت ابوطالب کے عذاب کی جو نوعیت تجویز کی گئی ہے کیا اس سے شفاعت پیغمبر کی بے وزنی و بے اثری ثابت نہیں ہوتی جب کہ اس قسم کی روایات میں یہ تک کہا گیا ہے کہ "اگرچہ وہ جہنم کی اوپر کی سطح پر ہوں گے مگر ان کا بھیجا پگھل پگھل کر ان کے پیروں پر بہہ رہا ہوگا۔ کیا شفاعتِ رسولؐ کے بعد اس ہولناک اور لرزہ انگیز عذاب کا تصور صحیح ہو سکتا ہے اور کیا یہ بہتر نہ تھا کہ ان کے لئے شفاعت کو تجویز ہی نہ کیا جاتا تاکہ شفاعت کی سبکی و بے قدری ظاہر نہ ہوتی اور پھر اس جاں نثاری و جانفشانی کے صلہ میں ان کے لئے جہاں تخفیف عذاب کی شفاعت تجویز کی جاتی ہے وہاں یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ پیغمبر ان کے لئے دعا کرتے کہ خدا انہیں ایمان کی توفیق دے جب کہ پیغمبر کی یہ دلی خواہش بھی تھی کہ وہ ایمان سے سرفراز ہوں اور اس طرح کی دعا دوسروں کے حق میں کر بھی چکے تھے۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ تحریر کرتے ہیں :۔

دعا لام ابی هريرة فامنت فی يومها (حجۃ اللہ البالغہ۔ ج ۲۔ ص ۵۵)
"آنحضرتؐ نے ابوہریرہ کی ماں کے لئے دعا فرمائی اور وہ اسی دن مسلمان ہو گئی۔"

یہ تو نہ ہو سکتا تھا کہ ابوہریرہ کی ماں کے بارے میں تو ان کی دُعا قبول ہو جاتی اور ابوطالب کے بارے میں بے اثر ہو کر رہ جاتی جب کہ اُم ابوہریرہ کی کوئی خصوصیت بھی نظر نہیں آتی سوائے اس کے کہ وہ ابوہریرہ کی ماں تھی اور ابوطالب کے اور خدمات سے قطع نظر کرتے ہوئے بھی دیکھا جائے تو صرف تربیت رسولؐ کے سلسلہ میں ان کے خدمات کا مقابلہ نہیں ہو سکتا۔ کیا پیغمبر کی تربیت و کفالت میں ان کی تندہی و جانفشانی ان کی نجات کی ضامن نہیں ہو سکتی جب کہ آنحضرتؐ کا یہ ارشاد زبان زد خلائق ہے کہ انا و کافل الیتیم فی الجنة کھاتین (ترمذی ص ۲۸۵) میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں ساتھ ساتھ ہوں گے۔" کیا ابوطالب سے بڑھ کر یتیم کی کفالت میں

کسی کا درجہ بلند تر ہو سکتا ہے جنہوں نے اپنی اولاد کو بھوکا رکھ کر یتیم عبداللہ کی پرورش کی ہو اپنا خون پسینہ ایک کر کے انہیں پروان چڑھایا ہو اور اپنی جان و مال اور اولاد کے نثار کرنے میں بھی دریغ نہ کیا ہو۔

پانچویں دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ حدیث نبوی میں وارد ہوا ہے کہ: لا توارث بین اھل ملتین ۔ "دو جداگانہ ملتوں میں باہمی توارث نہیں ہوتا" چنانچہ کافر مسلمان کا اور مسلمان کافر کا وارث نہیں ہو سکتا۔ اگر ابو طالب مسلمان ہوتے تو حضرت علی اور جعفر طیار کو بھی ان کے ترکہ میں سے حصہ ملتا۔ اور وہ اپنے حصے کا مطالبہ کرتے۔ لیکن ان دونوں نے اس بنا پر انکار کر دیا کہ مسلمان کافر کا وارث نہیں ہوا کرتا۔ اور عقیل اور طالب اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے اس لئے وہی ان کے وارث قرار پائے۔

یہ دلیل صرف ایک مغالطہ ہے جسے نظر فریب بنانے کے لئے پہلے تو ایک بے سند روایت پیش کی جاتی ہے کہ علیؑ اور جعفرؑ نے ابو طالب کی میراث میں سے حصہ لینے سے انکار کر دیا تھا۔ اور پھر ایک حدیث سے اس کو تقویت دی جاتی ہے کہ یہ انکار ابو طالب کے کفر کی بنا پر تھا۔ حالانکہ نہ حدیث کا یہ مفہوم ہے اور نہ کسی صحیح سند سے یہ ثابت ہے کہ انہوں نے میراث سے انکار کیا تھا۔ اس حدیث کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ اگر وارث و مورث میں اتحاد مذہب نہ ہو تو ان میں باہمی توارث نہیں ہوتا۔ اس طرح کہ اگر باپ مسلمان ہو اور بیٹا کافر تو کافر وارث نہیں ہو گا۔ اور اگر باپ کافر ہو اور بیٹا مسلمان ہو تو بیٹا وارث نہیں ہو گا۔ یعنی عدم توارث اس وقت صادق آئے گا جب مسلمان کافر کا اور کافر مسلمان کا وارث قرار نہ دیا جائے۔ حالانکہ اگر ایک وارث ہو اور دوسرا وارث نہ ہو بایں صورت کہ کافر مسلمان کا وارث نہ ہو اور مسلمان کافر کا وارث ہو تو اس صورت میں بھی عدم توارث صادق آتا ہے کیونکہ جب توارث کے معنی یہ ہیں کہ دو آپس میں ایک دوسرے کے وارث ہوں تو درصورتیکہ ایک وارث ہو اور دوسرا وارث نہ ہو تو یہ بھی عدم توارث ہے اس لئے کہ توارث طرفین کی نفی کی ایک صورت یہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے وارث نہ ہوں۔ اور ایک صورت یہ ہے کہ ایک وارث ہو اور دوسرا وارث نہ ہو۔ لہذا اگر مسلمان کافر کا وارث ہو اور کافر مسلمان کا وارث نہ ہو تو ان میں توارث کی نفی صحیح ہو گی۔ اور فقہائے امامیہ کے نزدیک صورت مسئلہ بھی یہی ہے کہ مسلمان کافر کا بھی وارث ہوتا ہے اور مسلمان کا بھی۔ اور کافر صرف کافر کا وارث ہوتا ہے اور مسلمان کے ترکہ میں سے کچھ نہیں پاتا تاکہ اسلام کی بالا دستی قائم رہے جیسا کہ حدیث میں وارد ہوا ہے: الاسلام یعلو ولا یعلی علیہ ۔ اسلام کو سب پر تفوق حاصل ہے اور اس پر کسی کو بالادستی حاصل نہیں" لہذا ابو طالب کو اگر کافر بھی فرض کر لیا جائے تو یہ کفر اس کا باعث نہیں ہو سکتا کہ ان کی مسلمان اولاد ان کے ترکہ سے محروم رہے۔ اور اسلام کو بھی کفر کی طرح موجب حرمان ارث قرار دے کر اسلام کے آگے ایک دیوار کھڑی کر دی جائے۔ اگر اسلام

کا قانونِ وراثت یہی ہوتا کہ مسلمان کسی کافر کا وارث نہیں ہو سکتا۔ تو وہ صحابہ جن کے والدین کفر کی حالت میں مرے تھے انہیں اپنے ماں باپ کا وارث نہ ہونا چاہئے تھا حالانکہ تاریخ ایک فرد کی بھی نشاندہی نہیں کرتی جو اسلام کی بنا پر کافر ماں باپ کے ورثہ سے محروم قرار دی گئی ہو۔ تو کیا یہ میراث سے محرومی خاندان پیغمبرؐ ہی کے لئے مخصوص تھی؟ پھر اس کا کیا ثبوت ہے کہ اگر حضرت علیؑ نے ابو طالب کے ترکہ میں سے کچھ نہیں لیا تو ان کے کفر کی بنا پر جب کہ یہ بھی احتمال ہے کہ انہوں نے اپنی قناعت پسندی، سیر چشمی اور عدم احتیاج کی بنا پر نہ لیا ہو اور سب کچھ عقیل کے لئے چھوڑ دیا ہو یا عقیل نے قبضہ کر لیا اور انہوں نے اس سے کوئی تعرض نہ کیا ہو۔ اور تاریخ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ مورخین نے لکھا ہے کہ جب پیغمبرؐ اکرم مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ آ گئے تو عقیل نے آنحضرتؐ کے ترک وطن سے فائدہ اٹھایا اور حضرت خدیجہؓ کا مکان اور وہ مکانات جو عبدالمطلب سے ابوطالب کی طرف منتقل ہوئے تھے ابوسفیان کے ہاتھ بیچ ڈالے۔ اس موقع پر نہ پیغمبرؐ موجود تھے نہ علیؑ اور جعفر کہ انہیں روکتے یا قیمت فروخت میں سے اپنے حصہ کا مطالبہ کرتے۔ اور جب فتح مکہ کے بعد کچھ کہنے سننے کا موقع آیا تو درگزر سے کام لیا۔ اس درگزر کو تنہا عقیل کے استحقاقِ میراث کی دلیل نہیں قرار دیا جا سکتا جب کہ اُن کا یہ تصرف حالات سے فائدہ اٹھانے کے نتیجہ میں تھا نہ میراث کی بنا پر۔ چنانچہ ابن شہاب کہتے ہیں :۔

الحق ان عقیلا رضی اللہ عنہ انما استولی علیٰ بیوت عبدالمطلب بعد الھجرۃ کما استولت کفار قریش علیٰ سائر دور المھاجرین ولو کان استحقاق عقیل لھا بالارث لما ساغ لہ بیع بیت خدیجۃ بنت خویلد رضی اللہ عنھا۔

(برحاشیہ فائق۔ ج ۱۔ ص ۱۸۸)

حق بات یہ ہے کہ عقیل رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہجرتِ رسولؐ کے بعد عبدالمطلب کے گھروں پر قابض ہو گئے تھے جس طرح کفار قریش نے مہاجرین کے متروکہ گھروں پر قبضہ جما لیا تھا اور فتح مکہ کے بعد نہ پیغمبرؐ اکرم نے اور نہ مہاجرین میں سے کسی نے ان گھروں کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ اگر ان مکانوں پر عقیل کا استحقاق ورثہ کی بنا پر تھا تو پھر انہوں نے خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ عنہا کا مکان کس حقِ وراثت کی بنا پر فروخت کیا تھا۔"

چھٹی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ کسی ضعیف سے ضعیف روایت سے بھی یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ابوطالب نے اکیلے یا پیغمبرؐ کے ساتھ کبھی نماز پڑھی ہو۔ حالانکہ وہ آنحضرتؐ کے اعلانِ رسالت کے بعد دس برس تک زندہ رہے۔ اگر وہ مسلمان ہو چکے ہوتے تو کبھی نہ کبھی تو نماز پڑھتے جب کہ نماز اسلام کا ایک لازمی فریضہ ہے اور اس کی پابندی ضروری ہے۔

یہ دلیل بھی کوئی وزن نہیں رکھتی۔ اس لئے کہ ایسے ماحول میں جہاں ان کے کفر کے اثبات کے لئے حدیثیں وضع کی جاتی ہوں اور انہیں خارج از اسلام ثابت کرنے کے لئے دلائل تراشے جاتے ہوں اگر کوئی ایسی روایت موجود نہ ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ تاہم اس سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اوائل بعثت میں جب انہوں نے اپنے فرزند حضرت علی کو پیغمبرؐ کے ساتھ نماز پڑھتے دیکھا تو اس پر اپنی خوشنودی و رضامندی کا اظہار کیا اور اس طریق عبادت کو عمل خیر سے تعبیر کر کے انہیں پیغمبرؐ سے وابستہ رہنے کی تاکید کی اور ایک مرتبہ علیؑ کو پیغمبرؐ کی داہنی جانب کھڑے ہو کر نماز پڑھتے دیکھا تو اپنے فرزند جعفر سے جو اسلام لا چکے تھے فرمایا :۔

صل جناح ابن عمك فصل على يساره (سیرت نبویہ دحلان ص۱۰۱)	تم بھی اپنے ابن عم کی بائیں جانب کھڑے ہو کر نماز پڑھو"

اگر انہوں نے بالفرض نماز میں شرکت نہیں تو اس لئے کہ قریش کی فتنہ سامانیوں کی روک تھام اور اُن کی شرانگیزیوں سے پیغمبر کا تحفظ کر سکیں۔ اور پھر ان کی زندگی میں نماز کو وجوبی حیثیت حاصل ہی نہ تھی اور نہ اس کی کوئی شکل متعین ہوئی تھی بلکہ صرف بطور نفل و استحباب پڑھی جاتی تھی۔ لہذا ان کے نماز نہ پڑھنے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ اسلام سے منحرف تھے۔

ساتویں دلیل یہ ہے کہ اگر وہ مسلمان ہوتے اور اسلام پر ان کا خاتمہ ہوتا تو پیغمبرؐ اسلام ان کی نماز جنازہ پڑھتے یا کسی کو پڑھنے پر مامور کرتے۔ اس لئے کہ یہ بھی اسلامی فرائض و دینی شعائر میں شامل ہے۔ حالانکہ کسی روایت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آنحضرتؐ نے یا کسی اور نے ان کی میت پر نماز ادا کی ہو۔

یہ شبہ سرے سے بے محل ہے اس لئے کہ نماز میت کا حکم اُن کے مرنے کے بعد نافذ ہوا اور اس دور کے مرنے والوں میں سے کسی کی نماز جنازہ نہیں پڑھی گئی۔ چنانچہ حضرت ابوطالب کی رحلت کے کچھ دنوں بعد اُم المومنین حضرت خدیجہؓ نے انتقال فرمایا تو ان کی نماز جنازہ بھی نہیں پڑھی گئی۔ حالانکہ ان کا نہ صرف اسلام مسلم ہے بلکہ اسلام میں سبقت بھی شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ بلاذری نے تحریر کیا ہے :۔

نزل رسول الله فى قبرها و لم يكن سنت الصلوٰة على الجنائز يومئذ (انساب الاشراف ج ۱ ص۴۰۶)	رسولؐ اللہ حضرت خدیجہؓ کی قبر میں اُترے اور اس وقت میت پر نماز جنازہ کا حکم نافذ نہ ہوا تھا"

یہ ہے روایات و شبہات کا وہ پلندہ جو ابوطالب کے کفر کے اثبات کے لئے فراہم کیا گیا ہے اور انہی روایتوں اور من گھڑت دلیلوں پر اعتماد کرتے ہوئے ان کے کفر و شرک پر اصرار کیا جاتا ہے حالانکہ ان کے صریحی اعتراف ایمان پیغمبرؐ اکرم کی شہادت اور ائمہ اطہار کے اجماع و اتفاق کے بعد ان کے ایمان سے انکار کا کوئی

محل نہیں رہتا۔ اور ہر صاحب بصیرت ان بے سر و پا روایتوں اور خود ساختہ دلیلوں کو دیکھ کہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ ان میں مغالطہ آفرینیوں اور ابلہ فریبیوں کے سوا کچھ نہیں ہے۔

حضرت ابوطالب دین کے محافظ اسلام کے پشت پناہ اور پیغمبرؐ اسلام کے لئے ایک دفاعی حصار اور مستحکم قلعہ تھے۔ انہوں نے شدید سے شدید مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور کسی موقع پر نہ حرف شکایت لب پر آیا اور نہ جبین پر شکن آئی۔ اور اپنی جوانی و پیرانہ سالی میں ایک لمحہ بھی پیغمبرؐ کی حفاظت میں فروگزاشت اور اسلامی خدمات میں کوتاہی کے مرتکب نہیں ہوئے۔ بلکہ بستر مرگ پر بھی اُن کا ذہن اسلام اور بانیٔ اسلام کے تحفظ کی فکر و ں سے خالی نہ تھا۔ چنانچہ جب شعب ابی طالب کی پیہم و مسلسل جان گداز مصیبتوں کے نتیجہ میں صحت نے جواب دے دیا اور موت کے آثار نظر آنے لگے تو شیوخ و عمائد قریش کو طلب کیا اور انہیں امانت، صدق بیانی، صلۂ رحم، فقراء کی اعانت و دستگیری اور خانہ کعبہ کے احترام کی ہدایت کے بعد آنحضرتؐ کی حفاظت و نصرت کی وصیت کرتے ہوئے فرمایا:۔

انا اوصیکم بمحمد خیرا فانه الامین فی قریش والصدیق فی العرب وهو جامع لکل ما اوصیکم به وقد جاء بامر قبله الجنان و انکره اللسان مخافة الشنان و ایم الله کانی انظر الی صعالیك العرب و اهل البر فی الاطراف والمستضعفین من الناس قد اجابوا دعوته وصدقوا کلمته وعظموا امره فخاض بهم غمرات فصارت رؤسا قریش وصنادیدها اذنابا ودورها خرابها وضعفاءها اربابا واذا اعظمهم علیه احوجهم الیه وابعدهم منه احظاهم عنده قد محضته العرب ودادها واصفت	میں تمہیں محمدؐ کے ساتھ بھلائی کی وصیت کرتا ہوں وہ قریش میں امین اور عرب میں صدیق ہیں اور اُن میں وہ تمام صفتیں موجود ہیں جن کی میں نے تمہیں وصیت کی ہے وہ ایسی چیز لے کر آئے ہیں جس کے دل معترف ہیں اور زبانیں عداوت کے ڈر سے چپ ہیں۔ خدا کی قسم گویا یہ منظر میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ عرب کے فقراء اور اطراف و جوانب کے بادیہ نشین اور کمزور افراد ان کی آواز پر لبیک کہہ رہے ہیں۔ محمدؐ انہیں لے کر سختیوں کے بھنور میں اُتر پڑے ہیں اور قریش کے سربلند پست اور سردار ذلیل ہو گئے ہیں اُن کے گھر اجڑ گئے ہیں۔ اور کمزور و ناتواں افراد برسر اقتدار آ گئے ہیں۔ باعظمت لوگ ان کے دست نگر ہو گئے ہیں اور دور والے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ عرب ان کے مخلص دوست اور دل کی پاکیزگی کے ساتھ ہمنوا ہو گئے ہیں اور انہیں اپنی قیادت

له فوادها واعطته قيادها دونكم يامعشر قريش ابن ابيكم كونوا له ولاة ولحزبه حماة و والله لا يسلك احد سبيله الا رشد ولا ياخذ احد بهديه الا سعد ولو كان لنفسي مدة ولاجلي تاخير لكفيت عنه الهزاهز ولدفعت عنه الدواهي۔ (ثمرات الاوراق۔ ج۲۔ صـ۱۳)	سونپ دی ہے۔ اے گروہ قریش تم بھی محمد (صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم) کے دوست اور ان کی جماعت کے مددگار بن جاؤ۔ خدا کی قسم جو بھی اُن کے بتائے ہوئے راستے پر چلے گا وہ ہدایت پائے گا۔ اور جو بھی اُن کے طریقہ پر عمل کرے گا خوش بخت ہوگا اگر مجھے کچھ اور زندگی ملتی اور میری موت میں تاخیر ہوتی تو میں ان سے دشمن کے حملوں کو روکتا اور مصیبتوں سے انہیں بچاتا۔"

اس عمومی وصیت کے بعد اولاد عبدالمطلب سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:۔

لن تزالوا بخير ما سمعتم من محمدؐ وما اتبعتم امره فاتبعوه واعينوه ترشدوا۔ (طبقات ابن سعد۔ ج۱۔ صـ۱۲۳)	جب تک تم محمدؐ کی بات سنتے رہو گے اور ان کے احکام کی پیروی کئے جاؤ گے خیر و سعادت سے بہرہ ور رہو گے ان کی پیروی کرو ان کا ہاتھ بٹاؤ ہدایت یافتہ رہو گے۔"

زندگی کے آخری لمحوں میں پیغمبرؐ کی صداقت و امانت کی گواہی دینا اور خیر و سعادت اور رشد و ہدایت کو ان کے اتباع سے وابستہ کرنا اعترافِ رسالت و تصدیق نبوت نہیں ہے تو کیا ہے۔ اور کیا یہ ہدایت آموز و ایمان افروز کلمات ان کے اسلام کے آئینہ دار نہیں ہیں؟

جب وصیت کر کے اپنے فریضہ سے سبکدوش ہوگئے تو موت کے آثار ظاہر ہوئے۔ چہرے کا رنگ بدل گیا، پیشانی پر پسینہ آیا اور پیغمبرؐ کا سب سے بڑا ناصر و مددگار اور سرپرست و غمگسار چھیاسی برس کی عمر میں جوارِ رحمت میں پہنچ گیا۔ آنحضرتؐ پر کوہِ غم و الم ٹوٹ پڑا، آنکھوں میں آنسو امڈ آئے اور گلو گیر آواز میں علیؑ سے فرمایا:۔

اذهب فغسله وكفنه ووارِه غفر الله ورحمه (طبقات ابن سعد۔ ج۱۔ صـ۱۰۵)	جاؤ انہیں غسل دو کفن پہناؤ اور دفن کا سامان کرو خدا ان کی مغفرت کرے اور اپنی رحمت ان کے شامل حال رکھے۔"

آنحضرتؐ نے غسل و کفن کی انجام دہی پر حضرت علیؑ کو مامور فرمایا حالانکہ آپ اپنے بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ عقیل اور طالب اس وقت تک زمرۂ اسلام میں شمار نہ ہوتے

تھے۔ اور ابوطالب ایسے مسلم و مومن کا غسل و کفن کسی غیر مسلم سے متعلق نہیں کیا جا سکتا تھا۔ حضرت جعفرؑ اگرچہ اسلام لا چکے تھے مگر اس موقع پر وہ بلادِ حبشہ میں تھے۔ اب اولادِ ابوطالب میں ایک علیؑ ہی ایسے تھے جو اس فریضہ کو انجام دے سکتے تھے۔ یہ چیز بھی ابوطالب کے ایمان پر روشنی ڈالتی ہے۔ اس لئے کہ اگر ابوطالب کافر ہوتے تو ان کا غسل و کفن حضرت علی کے بجائے ان کی ہم مذہب و ہم مسلک اولاد سے متعلق کیا جاتا۔ کیونکہ ایک مسلمان سے یہ خدمت نہیں لی جا سکتی کہ وہ ایک کافر کو غسل و کفن دے۔ غرض حضرت علیؑ نے غسل و کفن دیا۔ آنحضرتؐ تشریف فرما تھے، اپنے محسن و مربی چچا کو کفن میں لپٹا ہوا دیکھ کر بہت روئے۔ اور فرمایا:۔

یاعم ربیت صغیرا و کفلت یتیما و نصرت کبیراً جزاک اللہ عنی خیرا۔ (تاریخ یعقوبی۔ ج ۲۔ ص ۲۶)	اے چچا آپ نے بچپن میں پالا، یتیمی میں میری کفالت کی، بڑا ہونے پر میری نصرت و حمایت کی۔ خداوند عالم میری طرف سے آپ کو جزائے خیر دے"

جب جنازہ اٹھا کر لے چلے تو آپ کندھا دیتے ہوئے شروع سے آخر تک شریک جنازہ رہے اور اس کوہِ صبر و ثبات کو کوہِ حجون کے دامن میں دفن کر کے واپس ہوئے۔

آنحضرت کے لئے ابوطالب کی موت ایک عظیم سانحہ تھی۔ ان کا سب سے بڑا حامی و پشت پناہ جاتا رہا تھا اور آپ خونخوار دشمنوں کے نرغہ میں بے یار و مددگار رہ گئے تھے۔ اگرچہ مسلمانوں کی تعداد بڑھ گئی تھی مگر ان میں ابوطالب ایسا با اثر کوئی نہ تھا جو قریش کے بڑھتے ہوئے مظالم کا انسداد کر سکے۔ چنانچہ ان کے اٹھ جانے کے بعد قریش کے مظالم میں شدت پیدا ہو گئی اور آپ پر ظلم و ستم کے اتنے پہاڑ توڑے کہ ابوطالب کی زندگی میں اس قدر مظالم ڈھانے کی انہیں جرأت و جسارت نہ ہو سکتی تھی۔ ابن ہشام نے تحریر کیا ہے:۔

فلما هلك ابوطالب نالت قريش من رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم من الاذی مالم تكن تطمع فی حیات ابی طالب۔ (سیرت ابن ہشام۔ ج ۲۔ ص ۵۸)	جب ابوطالب وفات پا گئے تو قریش نے آنحضرتؐ کو اتنی تکلیفیں دیں کہ ابوطالبؑ کی زندگی میں ستانے کی اتنی ہوس ان کے دلوں میں پیدا نہ ہو سکتی تھی"

ابوطالب کی وفات کا غم ابھی تازہ ہی تھا کہ ان کی رحلت کے ایک مہینہ یا پانچ دن بعد جناب خدیجہؓ نے بھی انتقال فرمایا۔ اس حادثہ کا بھی رسول اللہ کو انتہائی رنج و قلق ہوا اور آپ نے ان دونوں کے مرنے کا یکساں غم منایا۔ اور اپنے غم و حزن کی یاد باقی رکھنے کے لئے اس سال کا نام "عام الحزن" (غم واندوہ

کا سال) رکھا۔ اور فرمایا:۔

اجتمعت علی ھذہ الامۃ فی ھذہ الایام مصیبتان لاادری بایھما انا اشد جزعاً۔

(تاریخ یعقوبی۔ ج ۲۔ ص ۲۹)

ان دنوں اس امت پر دو عظیم حادثے ایک ساتھ وارد ہوئے ہیں۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ ان دونوں صدموں میں سے کون سا صدمہ میرے لئے زیادہ رنج وکرب کا باعث ہے۔"

آنحضرتؐ نے حضرت ابوطالب اور حضرت خدیجہؑ کی وفات کو اپنی امت کے لئے ایک حادثۂ عظمیٰ ومصیبت فاجعہ قرار دیا ہے۔ اس لئے کہ ابتدائے بعثت میں یہی وہ دو ہستیاں تھیں جنہوں نے اسلام کے نشر وفروغ میں نمایاں کردار ادا کیا اور پیغمبرؐ اکرم کی نصرت وحمایت کا بیڑا اٹھایا تھا۔ ایک نے اپنی ساری دولت آنحضرتؐ کے قدموں پہ نچھاور کر دی اور دوسرا استبدادی طاقتوں کے مقابل میں سینہ سپر بن کر کھڑا ہوگیا۔ اگر احسان شناسی کا جذبہ اور حسن خدمات کا احساس ہو تو یہ دونوں موتیں جو پیغمبر کی زندگی کے عظیم حادثہ تھیں، امت کے لئے بھی ایک ناقابل فراموش المیہ ہوں گی۔

اہل مکہ نے سردار قریش، یادگار عبدالمطلب، رئیس بطحا ابوطالب کے مرنے پر سوگ منایا اور حضرت علیؑ نے اپنے اس عظیم باپ کی وفات پہ پردرد مرثیے کہے۔ ایک مرثیہ کے چند اشعار یہ ہیں:۔

ابا طالب عصمۃ المستجیر وغیث المحول ونور الظلم

اے ابوطالب آپ پناہ مانگنے والوں کے لئے دارالامان، قحط سالی میں ابر باراں اور تاریکیوں میں شمع درخشاں تھے۔"

لقد ھد فقدک اھل الحفاظ فصلی علیک ولی النعم

آپ کی موت سے ارباب غیرت وحمیت کو انتہائی صدمہ ہوا۔ خداوند عالم آپ پر رحمت فراواں نازل کرے۔

ولقاک ربک رضوانہ فقد کنت للطھر من خیرھم

آپ کو اللہ تعالیٰ کی رضا وخوشنودی نصیب ہو آپ نبیؐ پاک کے بہترین چچا تھے۔"

(تذکرۂ سبط ابن جوزی۔ ص ۶)